رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب

ڈاکٹر [illegible] اعزاز احمد صاحب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

منصوبہ اضافی مطالعہ

رام پرشاد بسمل
کی
آپ بیتی

مرتب

ڈاکٹر وشوامتر اُپادھیائے

مترجم

احسان احمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی110066

Ram Prasad Bismil ki Aapbeti

By : Dr. Vishwamitre Upadhiai

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جنوری۔مارچ 2003 شک 1924
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : =/33
سلسلۂ مطبوعات : 1068

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، ملک بھر کے بچوں کو ان کی مادری زبانوں کے ذریعے تعلیم دیے جانے کا ایک مکمل اور جامع طریق کار وضع کر کے اس پر عمل پیرا ہے۔ اس منصوبے کے تحت اردو زبان میں بھی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجوں کے لیے نصابی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ کی تیار کردہ ہیں۔ اردو میں ان کے ترجمے کا کام قومی اردو کونسل کی وساطت سے ہوا ہے۔

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ نے اسکول کی سطح کی سو سے زیادہ معاون درسی کتابیں بھی انگریزی اور ہندی میں چھاپی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ اردو طلبہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے منتخب کتابوں کے اردو تراجم شائع کیے جائیں۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے مددگار ثابت ہوگی اور اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

نئی دہلی

حرف آغاز

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں وقتاً فوقتاً بچوں کے لیے مختلف طرح کی معاون درسی کتب کی اشاعت ہوتی رہی ہے تاکہ بچوں کو سائنس اور دیگر مضامین کے ارتقاء سے پوری طرح واقفیت ملتی رہے۔ ساتھ ہی ان کو ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں اور ادبی اور فنی روایت کی بھی آگاہی ہوتی رہے۔ ان معاون درسی کتب کے ذریعے بچوں کو مشہور سائنس دانوں قومی بزرگوں، ادبی شخصیات، سماجی مصلحین اور ادیبوں کی حیات اور کارناموں کی مکمل معلومات حاصل ہوتی ہے۔

1986 کی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت تیار کیے گئے نصاب میں معاون مطالعے کے لیے کتابوں کے پڑھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ طلبہ درسی کتب کے علاوہ مزید مطالعہ کے لیے کچھ دیگر کتابیں پڑھیں۔ مزید مطالعہ میں بچوں کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کونسل نے "منصوبہ اضافی مطالعہ" کے تحت کچھ کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ "رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی" اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب مشہور صحافی اور ادیب مرحوم ڈاکٹر شو مترا پاد صیائے نے کی ہے۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے سینٹر فار انڈین لینگویجز کے ریٹائرڈ پروفیسر اور صدر ڈاکٹر نامور سنگھ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس منصوبے میں اپنا بھرپور تعاون دیا اور رہنمائی بھی کی۔

سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز کے صدر شعبۂ پروفیسر ارجن دیو نے اس منصوبے کو نئی جہت عطا کرنے میں اپنا بیش قیمت تعاون دیا ہے۔ شعبہ کے معاون پروفیسر رام جنم شرما نے اس منصوبے میں شائع ہونے والی کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی کو آخری شکل دی ہے۔ جناب شیو پرکاش نے کتاب کو تیار کرنے میں خصوصی تعاون دیا۔ میں ان سب کے لیے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس سلسلے کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کو ہر زاویہ نگاہ سے مکمل اور مستند بنانے کے لیے قومی سطح کے مختلف ماہرین،

آفیسروں، عالموں اور اساتذہ کا تعاون حاصل کیا گیا ہے۔ ان سب کے لیے میں خاص طور پر شکر گزار ہوں۔

اُمید ہے بچوں کی ادبی تہذیبی اور لسانی صلاحیتوں کے نشو و نما میں اس منصوبے کی یہ کتاب خاص طور پر مفید ثابت ہو گی۔ کتاب کے بارے میں پُر خلوص تجاویز اور مشوروں کا ہم استقبال کریں گے۔

اشوک کمار شرما

ڈائرکٹر

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

دیباچہ

شہید رام پرشاد بسمل ہندوستان کی قابل فخر انقلابی تحریک کے صف اوّل کے رہنما اور اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ اس کے علاوہ وہ بے مثال قومی شاعر، ادیب اور کامیاب مترجم بھی تھے۔ رام پرشاد بسمل کی انقلابی کاروائیوں کی طرح ان کی ادبی تخلیقات نے حریت پسندوں کو جنگ اور ایثار کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ جنگ آزادی کے دوران حریت پسند عوامی جلسوں، جیلوں کی بیرکوں اور پھانسی کی کوٹھریوں میں بسمل کی جذبۂ حریت پسندی سے بھرپور، غزلیں اور نظمیں گاتے تھے یہ کتاب اسی بہادر انقلابی کی خودنوشت ہے۔ اسے پڑھ کر آج بھی ہمیں اپنے وطن کی جنگ آزادی کے دوران دی گئی قربانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ رام پرشاد بسمل نے یہ خودنوشت گورکھ پور جیل میں 19 دسمبر 1927 کو ہوئی اپنی پھانسی سے دو دن پہلے انتہائی مشکل حالات میں لکھ کر مکمل کی تھی۔ بنارسی داس چترویدی نے لکھا ہے۔

"رام پرشاد بسمل کی خودنوشت ہندی کی ممتاز خودنوشت ہے۔ جن حالات میں یہ لکھی گئی تھی ان کے درمیان سے گزرنے کا موقعہ لاکھوں میں سے کسی ایک ہی کو مل سکتا ہے۔"

بسمل نے اپنی یہ خودنوشت رجسٹر سائز کے کاغذوں پر پنسل سے لکھ کر تین قسطوں میں نہ جانے کس طرح خفیہ طریقے سے گورکھ پور کے مشہور کانگریسی رہنما دشرتھ پرشاد دویدی کو بھجوائی تھی۔ آخری قسط تو پھانسی سے ایک دن پہلے ہی دویدی صاحب کے پاس پہنچی تھی۔ دویدی صاحب نے اسے گنیش شنکر ودیارتھی کو دیا تھا۔ جنھوں نے اس خودنوشت کو 'کاکوری کے شہید' نام کی کتاب کے شروع میں شائع کرایا تھا۔ یہ خودنوشت تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم تخلیق ہے۔ اس میں رام پرشاد بسمل کی مفلوک الحال خانگی زندگی، ان کا اعلیٰ کردار، حب الوطنی اور ایثار کے جذبات اور عام آدمی کے ترقی و خوشحالی کی ان کی خواہش سے تو واقفیت ہوتی ہی ہے، اس میں ملک کی انقلابی تحریک، اس کے نظریات اور خوبیوں و خامیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس خودنوشت میں بسمل اگرچہ جنگ آزادی میں عسکری انقلاب کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ اپنے مطالعے اور تجربے کی بنیاد پر

اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نوجوانوں کو دہشت گردی اور انفرادی قتل کا راستہ چھوڑ کر کھلی عوامی تحریک میں شامل ہونا چاہیے۔ وہ نوجوانوں مزدوروں اور کسانوں کو منظم کر کے انھیں جنگ آزادی میں اُتارنے اور حقیقی سوشلزم کے نظریات کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

رام پرشاد بسمل اور ان کے خاندان نے غریبی کی زندگی گزاری تھی اور ملک کے غریب اور ناخواندہ عوام کے درد و کرب کو قریب سے دیکھا تھا۔ درحقیقت وہ انھیں غریب عوام اور محب وطن نوجوانوں کے حقیقی نمائندے تھے۔ دوسرے انقلابیوں اور حریت پسندوں کی طرح وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں عوام کو غریبی اور استحصال سے نجات دلائی جائے۔ یہی ان کا خواب تھا۔ اُن کے خواب اور عہد کو پورا کرنا ہی آج ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔ اس کے علاوہ رام پرشاد بسمل ہندو مسلم سکھ عیسائی تمام مذاہب فرقوں اور ذاتوں میں یک جہتی کے خواہاں تھے۔

اس کتاب میں شہید رام پرشاد بسمل کی خودنوشت من و عن پیش کی گئی ہے۔ لیکن اسکول کے طلبہ کے مدنظر اسے ان کی دلچسپی اور معیار کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد ملک میں طلبہ اور نوجوانوں کو جنگ آزادی اور ملک کی آزادی کے لیے کی گئی کشاکش اور جدوجہد، قربانیاں اور تحریک آزادی کے اقدار و روایات اور خوابوں کی پوری تعلیم دی جانی چاہیے۔ اُمید ہے کہ شہید رام پرشاد بسمل کی اس خودنوشت کے مطالعے سے طلباء کو انقلابی تحریک اور انقلابیوں کے نظریات کی جانکاری ملے گی اور ان کے دلوں میں جذبہ حب الوطنی، ایثار اور خدمت وطن کے جذبات پیدا ہوں گے۔

وشوامتر اُپادھیائے

بی۔55 گل مہر پارک
نئی دہلی-110049

اظہار تشکر

اس کتاب کی تیاری میں پُر خلوص تعاون کے لیے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ مندرجہ ذیل عالموں کو ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہے۔

پروفیسر نامور سنگھ، پروفیسر نرملا جین، مرحوم پروفیسر رویندر سری واستو، پروفیسر مجیب رضوی، ڈاکٹر پرمانند سری واستو، ڈاکٹر گناکر موے، ڈاکٹر کے ڈی شرما، ڈاکٹر نرنجن کمار سنگھ، ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی، ڈاکٹر نتیانند تیواری، ڈاکٹر مان سنگھ ورما، ڈاکٹر جے پال سنگھ ترنگ، ڈاکٹر ایس۔ پی مِتل، شری آر شوری راجن۔

گاندھی جی کا طلسم

میں تمھیں ایک طلسم دیتا ہوں۔ جب بھی تم شک و شبہ میں مبتلا ہو جاؤ یا تمھارا نفس تم پر حاوی ہونے لگے تو اس تجربہ کو آزماؤ:

جو سب سے غریب اور کمزور آدمی تم نے دیکھا ہو اُس کی شکل یاد کرو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جو قدم اُٹھانے کے بارے میں تم سوچ رہے ہو وہ اُس آدمی کے لیے کتنا مفید ہوگا۔ کیا اس سے اُسے کچھ فائدہ پہنچے گا؟ کیا اس سے وہ اپنی زندگی اور مقدر پر کچھ قابو پا سکے گا؟ دوسرے لفظوں میں کیا اس سے اُن کروڑوں لوگوں کو سوراج مل سکے گا جن کے پیٹ بھوکے اور روحیں بے چین ہیں۔

تب تم دیکھو گے کہ تمھارا شبہ مٹ رہا ہے اور نفس زائل ہو رہا ہے۔

مو۔ک۔ گاندھی

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر
باب اوّل ۔ ذاتی کردار	13
باب دوم ۔ حب الوطنی	38
باب سوم ۔ آزادزندگی	52
باب چہارم ۔ وسیع تنظیم	61

باب اوّل

ذاتی کردار

تومر دھار (1) میں چنبل ندی کے کنارے دو گاؤں آباد ہیں جو ریاست گوالیار میں بہت مشہور ہیں۔ کیوں کہ ان گاؤں کے باشندے بڑے سرکش ہیں۔ ان گاؤں کے باشندے ریاستی حکومت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ زمینداروں کا یہ حال ہے کہ جس سال ان کا جی چاہتا ہے ریاست کو لگان دے دیتے ہیں اور جس سال ان کا جی نہیں چاہتا مالگواری دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اگر تحصیل دار یا ریاست کا کوئی اور عہدے دار آتا ہے تو یہ زمیندار بیہڑ (2) میں چلے جاتے ہیں اور مہینوں بیہڑوں میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ اُن کے جانور بھی وہیں رہتے ہیں اور اُن کا کھانا پینا بھی بیہڑوں میں ہی ہوتا ہے۔ گھر پر کوئی ایسی بیش قیمت چیز نہیں چھوڑتے جسے نیلام کر کے مالگواری وصول کی جا سکے ایک زمیندار کے بارے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ مالگواری نہ دینے کی وجہ سے ہی اسے کچھ زمین معافی میں مل گئی۔ پہلے تو کئی سال فرار رہے۔ ایک بار دھوکے سے پکڑ لئے گئے تو تحصیل کے عہدے داروں نے انھیں بہت ستایا۔ انھیں کئی دن تک باندھے رکھا اور کھانے پینے کو بھی نہیں دیا۔ آخر کار جلانے کی دھمکی دے کر اس کے قدموں پر سوکھی گھاس ڈال کر آگ لگوادی۔ لیکن ان حضرت زمیندار نے لگان دینا منظور نہیں کیا۔ اور یہی جواب دیا کہ مہاراجہ گوالیار کے شاہی خزانے میں میرے ٹیکس نہ دینے سے گھاٹا نہیں پڑ جائے گا۔ دنیا کیا جانے گی کہ فلاں شخص اپنی سرکشی ہی کی وجہ سے اپنا وقت گزارتا ہے۔ ریاست کو لکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنی زمین ان حضرت کو معافی میں دے دی گئی۔ اس طرح ایک بار ان گاؤں کے لوگوں کو ایک عجیب و غریب کھیل سوجھا۔ انھوں نے مہاراجہ کے رسالے کے 60 اونٹ چرا کر

بیہڑوں میں چھپا دئے۔ ریاست کو لکھا گیا جس پر ریاست کی طرف سے حکم ہوا کہ دونوں گاؤں توپ لگا کر اُڑا دیے جائیں۔ نہ جانے کس طرح سمجھانے بجھانے سے وہ اونٹ واپس کئے گئے اور عہدے داروں کو سمجھایا گیا کہ اتنی بڑی ریاست میں تھوڑے سے بہادر لوگوں کی رہائش ہے انھیں بارود سے نہ اُڑانا ہی مناسب ہوگا۔ تب توپوں کو واپس کیا گیا اور گاؤں اڑائے جانے سے بچے۔ یہ لوگ اب ریاست کے باشندوں کو تو نہیں ستاتے تھے لیکن کئی بار انگریزی ریاست (3) کی حدود میں آکر تخریب کاری کر جاتے تھے اور دولت مندوں کے مکانوں پر چھاپہ مار کر راتوں رات ہی بیہڑ میں داخل ہو جاتے تھے۔ بیہڑ میں پہنچ جانے پر پولیس یا فوج کوئی بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ دونوں گاؤں انگریزی حکومت کی سرحد سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر چنبل ندی کے ساحل پر ہیں۔ یہیں کے ایک مشہور کنبے میں میرے دادا جناب نرائن لال پیدا ہوئے۔ وہ خاندانی تنازعات اور اپنی بھابی کے ناقابل برداشت برتاؤ کی وجہ سے مجبوراً اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ آخر میں اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ وہ شاہجہاں پور پہنچے۔ ان کے انھیں دو بیٹوں میں بڑے بیٹے جناب مرلی دھر میرے والد ہیں۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ سال اور ان کے چھوٹے بیٹے یعنی میرے چچا جناب کلیان مل کی عمر چھ سال تھی۔ اس وقت یہاں قحط سالی کا عذاب طاری تھا۔

نامساعد ایام

بڑی جدو جہد کے بعد شاہجہاں پور کے ایک عطار کی دکان پر میرے دادا جناب نرائن لال جی کو تین روپے ماہوار کی تنخواہ پر نوکری ملی۔ تین روپے ماہوار کی تنخواہ میں قحط سالی کے دور میں چار لوگوں کی کس طرح گزر بسر ہو سکتی تھی؟ دادی جی نے بہت کوشش کی کہ خود ایک وقت آدھا پیٹ کھانا کھا کے، بچوں کا پیٹ پالا جائے لیکن پھر بھی گزارہ نہ ہو سکا۔ باجرہ، مکئی، ساما، جوار، وغیرہ کھا کر دن کاٹنے چاہے لیکن پھر بھی گزارہ نہ ہوا۔ تب آدھا بھوا چنا یا کوئی دوسرا ساگ جو سب سے سستا ہو اس کو لے کر، سب سے سستا اناج اس میں آدھا ملا کر، تھوڑا سا نمک ڈال کر اسے خود کھاتیں اور لڑکوں کو چنے یا جو کی روٹی دیتی تھیں دادا جی بھی اسی طرح وقت گزارا کرتے۔ آدھا پیٹ کھا کر بڑی مشکل سے دن تو کٹ جاتا لیکن پیٹ میں گھونٹو دبا کر رات کاٹنا دشوار ہو جاتا۔ یہ تو کھانے کی حالت تھی کپڑے اور رہنے کی جگہ کے کرایے کے لیے روپیہ کہاں سے آتا؟ دادی نے چاہا کہ بھلے لوگوں کے

گھروں میں انھیں کوئی مزدوری ہی مل جائے لیکن انجان فرد کو جس کی زبان اپنے دیس کی زبان سے نہ ملتی ہو بھلے گھروں میں یک بیک کون یقین کر سکتا تھا؟ کوئی مزدوری پر اپنا اناج بھی پینے کے لیے نہ دیتا تھا۔ ڈر تھا کہ قحط سالی کا دور ہے کھالے گی۔ بڑی جدوجہد کے بعد دو ایک عورتیں اپنے گھروں پر اناج پسوانے کے لیے راضی ہوئیں لیکن پرانی کام کرنے والی مزدورن کو جواب کیسے دیں؟ اسی طرح کی رکاوٹوں کے بعد پانچ سات سیر اناج پینے کو مل جاتا جس کی پسائی اس وقت ایک پیسہ فی پنسیری تھی۔ بڑی مشکل سے آدھا پیٹ ایک وقت کھانا کھا کے تین چار گھنٹوں تک پسائی کر کے ایک پیسہ یا ڈیڑھ پیسہ ملتا۔ پھر گھر پر آ کر بچوں کے لیے کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ دو تین سال تک یہی حالت رہی۔ دادا جی اکثر اپنے گاؤں واپس جانے کا خیال ظاہر کیا کرتے لیکن دادی جی کا یہ جواب ہوتا کہ جن کی وجہ سے دیس (گاؤں) چھٹا دولت اور دوسری چیزیں برباد ہوئیں اور یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے اب انھیں کے پیروں میں سر رکھ کر غلامی قبول کرنے سے اسی طرح مر جانا بہتر ہے۔ یہ دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ ہر طرح کی مصیبت برداشت کی لیکن دادی جی دیس (گاؤں) کو لوٹ کر نہ گئیں۔

چار پانچ سال میں جب کچھ لوگوں سے جان پہچان ہو گئی اور وہ جان گئے کہ یہ عورت بھلے گھر کی ہے اور برے وقت کی وجہ سے خستہ حالی کا شکار ہے تب بہت سی عورتیں ان پر اعتماد کرنے لگیں۔ قحط سالی بھی ختم ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کسی شریف آدمی کے یہاں سے کچھ امداد مل جاتی کوئی برہمن کھانا کھلا دیتا۔ اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ کئی حضرات نے جو لاولد تھے اور صاحب حیثیت تھے۔ دادا جی کو طرح طرح کی ترغیب و تحریص دلائی کہ وہ اپنا ایک لڑکا انھیں دے دیں اور جتنی دولت چاہیں لے لیں۔ لیکن دادی جی ایک مثالی ماں تھیں۔ انھوں نے اس طرح کی ترغیب کی قطعی پرواہ نہ کی اور اپنے بچوں کی کسی نہ کسی طرح پرورش کرتی رہیں۔

محنت مزدوری اور چند تائی کے ذریعے کچھ پیسہ جمع ہوا۔ چند عمائد کے کہنے سے والد صاحب کو تعلیم کے لیے پاٹھ شالا میں داخل کر دیا گیا۔ دادا جی نے بھی کچھ جدوجہد کی۔ ان کی تنخواہ بھی بڑھ گئی اور وہ سات روپیہ ماہوار پانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے نوکری چھوڑ پیسے اور دونی چونی بیچنے کی دکان کی۔ پانچ سات آنے روز پیدا ہونے لگے۔ جو برے ایام آئے تھے جدوجہد اور

حوصلے سے دور ہونے لگے۔ اس کا تمام سہرا دادی جی کو جاتا ہے۔ جس ہمت اور حوصلہ سے انھوں نے کام لیا وہ درحقیقت کسی غیر مرئی طاقت کی امداد ہی کہی جائے گی۔ ورنہ ایک ان پڑھ دیہاتی عورت کی کیا بساط کہ وہ بالکل ایک انجان مقام پر جاکر محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہوئے انھیں تعلیم یافتہ بنائے اور پھر ایسے حالات میں، جب کہ اس نے کبھی بھی اپنی زندگی میں گھر سے باہر قدم نہ نکالا ہو اور جو ایسے کٹر دیس کی رہنے والی ہو جہاں پر ہر ہندو اقدار و روایات کی سختی سے پابندی کی جاتی ہو جہاں کے باشندے اپنی روایات کے تحفظ کے لیے جان کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوں کسی برہمن، چھتری یا ویش خاندان کی بہو کی کیا ہمت جو ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ نکالے بغیر ایک گھر سے دوسرے گھر چلی جائے۔

شودر ذات (4) (شمالی ہند کے تعلق سے) کی بہوؤں کے لیے بھی یہی اصول ہے کہ وہ راستے میں بغیر گھونگھٹ نکالے نہ جائیں۔ شودروں کا پہناوا ہی الگ ہے۔ تاکہ انھیں دیکھ کر ہی دور سے پہچان لیا جائے کہ وہ کسی نچلی ذات کی عورت ہے۔ یہ رسمیں اس بری طرح رائج ہیں کہ انھوں نے ظلم کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ایک بار کسی چمار کی بہو جو انگریزی ریاست سے بیاہ کر کے گئی تھی۔ خاندانی رسم کے مطابق زمیندار کے یہاں قدم بوسی کے لیے گئی۔ وہ پیروں میں بچھوے پہنے ہوئی تھی اور باقی تمام پہناوا چماروں کا پہنے تھی۔ زمیندار کی نگاہ اس کے پیروں پر پڑی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چمار کی بہو ہے۔ زمیندار صاحب جوتا پہن کر آئے اور اس کے پیروں پر کھڑے ہو کر اتنے زور سے دبایا کہ اس کی انگلیاں کٹ گئیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر چماروں کی بہوئیں بچھوے پہنیں گی تو اعلیٰ ذات کے گھر کی عورتیں کیا پہنیں گی؟ یہ اعلیٰ ذات کے لوگ بہت بے وقوف اور جاہل ہیں لیکن ذات کے غرور سے چور ہیں۔ غریب سے غریب ناخواندہ برہمن یا چھتری چاہے وہ کسی بھی عمر کا ہو اگر شودر ذات کی بستی میں سے گزرے تو چاہے کتنا ہی مالدار یا بزرگ شودر کیوں نہ ہو اسے اُٹھ کر قدم بوسی یا تعظیم دینا ہوگی۔ اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت وہ برہمن یا چھتری اسے جوتا مار سکتا ہے۔

خدا کے فضل سے یہ برے دن ختم ہوئے۔ والد صاحب نے کچھ تعلیم حاصل کرلی اور ایک مکان بھی دادا جی نے خرید لیا۔ دربدر بھٹکنے والے خاندان کو پرسکون انداز سے بیٹھنے کا مقام مل گیا اور پھر والد صاحب کی شادی کا خیال آیا۔ دادی جی دادا اور والد کو

لے کر اپنے میکے گئیں۔ وہیں والد صاحب کی شادی کر دی گئی۔ وہیں دو چار ماہ رہ کر سب لوگ بہو کو وداع کرا کے ساتھ لے آئے۔

ازدواجی زندگی

شادی ہو جانے کے بعد والد صاحب میونسپلٹی میں پندرہ روپے ماہوار کی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ انھوں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ والد صاحب کو یہ ملازمت پسند نہ آئی۔ انھوں نے ایک دو سال کے بعد ملازمت چھوڑ دی اور آزادانہ کاروبار کرنے کی کوشش کی اور کچہری (عدالت) میں سرکاری اسٹامپ فروخت کرنے لگے۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ اسی کاروبار میں گزرا۔ معمولی درجے کی ازدواجی زندگی اور اسی روزگار کے ذریعے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اور خاندان کی پرورش کی اور اپنے محلے کے ممتاز افراد میں شمار کیے جانے لگے۔ وہ روپے کا لین دین بھی کرتے تھے۔ انھوں نے تین بیل گاڑیوں کا بھی اہتمام کیا جو کرایے پر چلا کرتی تھیں۔ والد صاحب کو کاروبار سے عشق تھا۔ اُن کا جسم بڑا مضبوط اور سڈول تھا۔ وہ پابندی سے اکھاڑے میں کشتی لڑا کرتے تھے۔

والد صاحب کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ مر گیا۔ اس کے ایک سال بعد مصنف (رام پرشاد) نے جیٹھ شکل پکش گیارہ سمبت 1954 بکری کو جنم لیا۔ بڑے جتنوں سے منتیں مان کر تعویز گنڈوں کے ذریعے دادا جی نے اس جسم کی حفاظت کی کوشش کی۔ غالباً ہمارے گھر میں بچوں کی کوئی بیماری داخل ہو گئی تھی۔ اس لیے پیدائش کے ایک یا دو ماہ بعد میرے جسم کی حالت بھی پہلے بچے جیسی ہونے لگی۔ کسی نے بتایا کہ سفید خرگوش کو میرے جسم پر گھما کر زمین پر چھوڑ دیا جائے اگر بیماری ہو گی تو خرگوش فوراً مر جائے گا۔ کہتے ہیں ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک خرگوش میرے جسم پر سے اُتار کر جیسے ہی زمین پر چھوڑا گیا ویسے ہی اس نے تین چکر کاٹے اور مر گیا۔ میرے خیال سے کسی حد تک ممکن بھی ہے کیوں کہ ادویات تین طرح کی ہوتی ہیں۔

(1) دیوک (خدائی) (2) انسانی (3) شیطانی

شیطانی ادویات میں مختلف طرح کے جانوروں یا پرندوں کے گوشت یا خون کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا استعمال بید ک

یوپ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس میں سے ایک بڑا مجزاتی اور حیرت انگیز تجربہ یہ ہے کہ جس بچے کو سوکھے کی بیماری ہو گئی ہو اگر اس کے سامنے چمگادڑ چیر کر لائی جائے تو ایک دو ماہ کا بچہ چمگادڑ کو پکڑ کر خون چوس لے گا اور بیماری جاتی رہے گی۔ یہ بڑی کارآمد دوائی ہے اور ایک مہاتما کی بتائی ہوئی ہے۔

جب میں سات سال کا ہوا تو والد صاحب نے خود ہی مجھے ہندی حروف لکھنا سکھایا اور ایک مولوی صاحب کے مکتب میں اردو پڑھنے کے لیے بھیج دیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب اکھاڑے میں کشتی لڑنے جاتے تھے اور اپنے سے زیادہ طاقتور اور جسم میں ڈیڑھ گنا پٹھے کو پٹک دیتے تھے۔ کچھ دن بعد والد صاحب کا ایک بنگالی (مسٹر چٹرجی) سے دوستانہ ہو گیا۔ حضرت چٹرجی کی انگریزی دوائیوں کی دکان تھی۔ وہ بڑے بھاری نشے باز تھے۔ ایک وقت میں آدھی چھٹانک چرس کی چلم پیا کرتے تھے۔ ان کی ہی صحبت میں والد صاحب نے چرس پینا سیکھ لیا جس کی وجہ سے ان کا جسم کافی کمزور ہو گیا۔ دس سال میں ہی سارا جسم سوکھ کر ہڈیاں نکل آئیں۔ حضرت چٹرجی شراب بھی پینے لگے۔ جس کی وجہ سے ان کا کلیجہ بڑھ گیا اور اسی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ میرے بہت سمجھانے پر والد صاحب نے اپنی چرس پینے کی عادت ترک کر دی۔ لیکن بہت دنوں بعد۔

میرے بعد پانچ بہنیں اور تین بھائیوں کی پیدائش ہوئی۔ دادی جی نے کہا کہ خاندان کی رسم کے مطابق لڑکیوں کو مار ڈالا جائے لیکن والدہ صاحبہ نے اس کی مخالفت کی اور لڑکیوں کی جان کی حفاظت کی۔ میرے خاندان میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ لڑکیوں کی پرورش ہوئی۔ لیکن ان میں سے دو بھائیوں اور دو بہنوں کا انتقال ہو گیا۔ باقی ایک بھائی اس وقت (1927) دس برس کا ہے، اور تین بہنیں باقی ہیں۔ والدہ کی کوششوں سے تینوں بہنوں کو اچھی تعلیم دی گئی اور ان کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کی گئیں۔ اس سے پہلے ہمارے خاندان کی لڑکیاں کسی کو نہیں بیاہی گئیں کیوں کہ وہ زندہ ہی نہیں رہتی تھیں۔ دادا جی بڑی سادہ فطرت کے انسان تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے پیسے بیچنے کا ہی کاروبار کرتے رہے۔ ان کو گائے پالنے کا بہت شوق تھا۔ خود گوالیار جا کر بڑی بڑی گائیں خرید لائے تھے۔ وہاں کی گائیں کافی دودھ دیتی ہیں۔ یہ گائیں بڑی سیدھی ہوتی ہیں۔ دودھ دوہتے وقت ان کی ٹانگیں باندھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جب جس کا جی چاہے ان کا دودھ دوہ سکتا ہے۔ بچپن میں میں اکثر جا کر گائے کے تھن

بھی معمولاً کر دودھ پیا کرتا تھا۔ حقیقت میں وہاں کی گائیں قابلِ دید ہوتی ہیں۔

دادا جان مجھے خوب دودھ پلایا کرتے تھے۔ انہیں اکھاڑہ کوئی (بگیا بکتا) کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ شام کو ہر روز شومندر میں جاکر وہ کھیلنے پہ اتنا کا مجمن کیا کرتے تھے۔ ان کا تقریباً پچپن سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

بچپن سے ہی والد صاحب میری تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے اور ذرا سی غلطی کرنے پر بہت مارتے تھے۔ مجھے یہ بات اب بھی بہت اچھی یاد ہے کہ جب میں دیوناگری (ہندی) کے حروف لکھنا سیکھ رہا تھا تو مجھے "ہو" ("उ") لکھنا نہ آیا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن جب والد صاحب کچہری چلے گئے تو میں بھی کھیلنے چلا گیا۔ والد صاحب نے کچہری سے آکر مجھ سے "ہو" لکھوایا میں لکھ نہ سکا۔ اس پر انہوں نے مجھے بندوق کے لوہے کے گز سے اتنا پیٹا کہ گز ٹیڑھا ہو گیا۔ میں بھاگ کر دادا جان کے پاس چلا گیا تب جان بچی۔ میں بچپن ہی سے شرارتی تھا۔ والد صاحب کے اتنے کنٹرول کے بعد بھی شرارتیں کرتا تھا۔ ایک بار کسی کے باغ میں جاکر آڑو کے درختوں میں سب آڑو توڑ ڈالے۔ اس وقت والد صاحب نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں دو دن تک اٹھ نہیں سکا۔ اسی طرح خوب پٹتا تھا لیکن شرارت ضرور کرتا تھا۔ شاید بچپن کی اس مار سے ہی یہ جسم بہت سخت اور برداشت کرنے والا بن گیا ہے۔

برائی کی شروعات

جب میں اردو کی چوتھی جماعت پاس کر کے پانچویں میں آیا تو میری عمر تقریباً 14 سال کی ہوگی۔ اس دوران مجھے والد صاحب کے صندوق سے روپے پیسے چرانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان پیسوں سے ناول خرید کر خوب پڑھتا۔ کتب فروش والد صاحب کے واقف کاروں میں سے تھے۔ انہوں نے والد صاحب سے میری شکایت کر دی۔ اب میری کچھ نگرانی ہونے لگی۔ میں نے ان حضرت سے کتابیں خریدنی ہی چھوڑ دیں۔ مجھے دو ایک خراب عادتیں بھی پڑ گئیں تھیں۔ میں سگریٹ پینے لگا۔ کبھی کبھی بھنگ بھی پی لیتا تھا۔ چھوٹی عمر میں آزادانہ پیسہ ہاتھ آجانے سے اور اردو کے عشقیہ اور رنگین ناولوں اور غزلوں کی کتابوں نے میرے کردار پر بھی اپنا برا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ گھن لگنا شروع ہوا ہی تھا کہ پرماتما نے بڑی مدد کی۔ میں ایک روز بھنگ پی کر والد صاحب کی صندوقچی میں سے روپے نکالنے گیا۔ نشے کی حالت میں ہوش و حواس میں نہ رہنے کی وجہ سے صندوقچی کھٹک گئی۔ والدہ

کو شک ہوا۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔ چابی بھی پکڑی گئی۔ میرے صندوق کی تلاشی لی گئی بہت سے روپے نکلے اور سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ میری کتابوں میں سے کئی ناول وغیرہ بھی نکلے جو اُسی وقت پھاڑ ڈالے گئے۔

پرماتما کی مہربانی سے میری چوری پکڑی گئی نہیں تو دو چار سال میں نہ دین کا رہتا اور نہ دنیا کا۔ اس کے بعد بھی میں نے بہت سی گھاتیں لگائیں لیکن والد صاحب نے صندوقچی کا تالا ہی بدل دیا تھا۔ میری کوئی چال نہ چل سکی۔ اب جب کبھی موقع مل جاتا تو والدہ کے روپیوں پر ہاتھ پھیر دیتا۔ اسی طرح کی بری عادتوں کی وجہ سے دو بار اردو مڈل کے امتحان میں پاس نہ ہو سکا۔ تب میں نے انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسری بار جب میں اردو مڈل کے امتحان میں فیل ہوا اسی وقت پڑوس کے دیو مندر میں جس کی دیوار میرے مکان سے ملی ہوئی تھی۔ ایک پجاری جی آئے۔ وہ بہت اچھے کردار کے انسان تھے۔ میں اُن کے پاس اُٹھنے بیٹھنے لگا۔

میں مندر میں آنے جانے لگا۔ کچھ پوجا پاٹھ بھی سیکھنے لگا۔ مجھ پر پجاری جی کی تلقین کا بہت اچھا اثر پڑا۔ میں اپنا زیادہ وقت بھجن پوجا اور پڑھنے میں گزارنے لگا پجاری جی مجھے برہم چریہ کی پابندی کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ وہ میرے رہنما بنے۔ میں نے ایک دوسرے صاحب کی دیکھا دیکھی کسرت کرنا شروع کر دی۔ اب تو مجھے بھگتی کی راہ میں کچھ لذت ملنے لگی اور چار پانچ مہینے میں ہی خوب کسرت بھی کرنے لگا۔ میری تمام بری عادتیں اور برے جذبات ختم ہو گئے۔ اسکول کی چھٹیاں ختم ہونے پر میں نے مشن اسکول کے انگریزی کے پانچویں درجے میں نام لکھالیا۔ اس وقت میری اور سب بُری عادتیں تو چھوٹ گئیں لیکن سگریٹ پینا نہ چھوٹا تھا۔ میں بہت سگریٹ پیتا تھا۔ ایک دن میں پچاس ساٹھ سگریٹ پی ڈالتا تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ میں اس زندگی میں سگریٹ پینے کی بری عادت کو نہ چھوڑ سکوں گا۔

اسکول میں داخل ہونے کے چند دن بعد ہی ایک ہم جماعت سشیل چندر سین سے کچھ خاص انسیت ہو گئی۔ انھیں کی مہربانی کی وجہ سے میری سگریٹ نوشی چھوٹ گئی۔

دیو مندر میں بھجن پوجا کرنے کے رجحان کو دیکھ کر منشی اندرجیت جی نے مجھے سندھیا کرنے کا مشورہ دیا۔ منشی جی مندر میں

رہنے والے کسی شخص سے ملنے آیا کرتے تھے۔ کسرت کرنے کی وجہ سے میرا جسم بہت سڈول ہو گیا اور رنگ نکھر آیا تھا۔

میں نے جاننا چاہا کہ سندھیا کیا چیز ہے۔ منشی جی نے آریہ سماج سے متعلق کچھ اُپدیش دیے۔ اس کے بعد میں نے ستیار تھ پرکاش (آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کے ذریعے لکھی گئی کتاب) پڑھی۔ اس سے کایا پلٹ ہی ہو گئی۔ ستیار تھ پرکاش کے مطالعہ نے میری زندگی کی تاریخ میں ایک نئے صفحہ کا اضافہ کر دیا۔ میں نے اس میں تحریر کردہ برہم چریہ کے سخت اصولوں کی پابندی کرنا شروع کر دیا۔ میں تخت پر ایک کمبل بچھا کر سوتا اور صبح چار بجے ہی بستر سے اُٹھ جاتا۔ پوجا پاٹھ اور نہانے دھونے کے بعد کسرت کرتا لیکن دل کی نیت ٹھیک نہ ہوتی۔ میں نے رات کے وقت کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا۔ رات کو صرف تھوڑا سا دودھ پیتا تھا۔ مرچ اور کھٹائی بالکل نہیں چھوتا تھا۔ میری صحت قابل رشک ہو گئی۔ سب لوگ میری صحت کو حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔

میں چند ہی دنوں میں کٹر آریہ سماجی ہو گیا۔ آریہ سماج کے اجتماع میں آتا جاتا۔ سنیاسی مہاتماؤں کے اُپدیش بڑی عقیدت سے سنتا۔ جب کوئی سنیاسی آریہ سماج میں آتا تو اس کی ہر طرح خدمت کرتا کیوں کہ میری سیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ جس سنیاسی کا نام سنتا شہر سے تین چار میل اس کی خدمت کے لیے جاتا۔ میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ سنیاسی کس مت کا پیرو ہے۔ جب میں انگریزی کی ساتویں جماعت میں تھا تب سناتن دھرمی پنڈت جگت پرشاد جی شاہ جہاں پور تشریف لائے۔ انھوں نے آریہ سماج کی مخالفت کرنی شروع کی۔ آریہ سماجیوں نے بھی ان کی مخالفت کرنی شروع کی اور پنڈت اکھل آنند جی کو بلا کر مناظرہ (شاستروں کا صحیح مفہوم جاننے کی بحث) کرایا۔ مناظرہ سنسکرت میں ہوا۔ عوام پر اچھا اثر پڑا۔ میرے کاموں کو دیکھ کر محلے والوں نے والد صاحب سے میری شکایت کی۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ آریہ سماجی ہار گئے۔ اب تم آریہ سماج سے اپنا نام کٹا دو۔ میں نے والد صاحب سے کہا آریہ سماج کے اصول عالمی ہیں انھیں کون ہرا سکتا ہے؟ مختلف بحث و مباحث کے بعد والد صاحب ضد پکڑ گئے کہ آریہ سماج سے استعفیٰ نہیں دے گا تو میں تجھے رات کو سوتے میں مار دوں گا یا تو آریہ سماج سے استعفیٰ دے یا گھر چھوڑ دے۔

میں نے یہ سوچا کہ اگر والد صاحب کا غصہ زیادہ بڑھ گیا اور انھوں نے مجھ پر کوئی ایسی چیز ڈال دی جس کے برے نتائج ہوں تو اچھا نہ ہوگا۔ اس لیے گھر چھوڑ کر چلا جانا ہی اچھا ہے۔ میں صرف ایک قمیص پہنے کھڑا تھا اور پاجامہ اتار کر دھوتی پہن رہا تھا پاجامے کے نیچے لنگوٹ بندھا تھا۔ والد صاحب نے ہاتھ سے دھوتی چھین لی اور کہا "گھر سے نکل۔" مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں والد صاحب کے پیر چھو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کہاں جاؤں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شہر میں کسی سے جان پہچان نہ تھی کہ جہاں چھپا رہتا۔ میں جنگل کی طرف چلا گیا۔ ایک رات اور ایک دن میں پیڑ پر بیٹھا رہا۔ بھوک لگنے پر کھیتوں میں سے ہرے چنے توڑ کر کھائے۔ ندی میں نہایا اور ناشتہ کیا۔ دوسرے دن شام کو پنڈت اکھل آنند جی کی تقریر آریہ سماج میں تھی۔ میں آریہ سماج مندر میں گیا۔ ایک پیڑ کے نیچے تنہائی میں تقریر سن رہا تھا کہ والد صاحب دو آدمیوں کو لے کر آپہنچے اور میں پکڑ لیا گیا۔ وہ اسی وقت مجھے پکڑ کے ہیڈ ماسٹر کے پاس لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب عیسائی تھے۔ میں نے انھیں ساری بات بتا دی۔ انھوں نے والد صاحب کو سمجھایا کہ سمجھدار لڑکے کو مارنا پیٹنا ٹھیک نہیں۔ انھوں نے مجھے بھی بہت سمجھایا۔ اس دن سے والد صاحب نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا کیوں کہ میرے گھر چھوڑ دینے سے گھر میں بہت پریشانی رہی۔ ایک رات اور ایک دن کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سب بڑے پریشان رہے کہ اکلوتا بیٹا نہ جانے ندی میں ڈوب گیا یا ریل سے کٹ گیا۔ والد صاحب کے دل کو بھی بہت صدمہ لگا۔ اس دن سے وہ میری ہر بات برداشت کر لیتے تھے۔ میں کافی محنت سے پڑھتا تھا اور اپنی جماعت میں اول درجے میں پاس ہوتا تھا۔ یہ حالت آٹھویں جماعت تک رہی۔

جب میں آٹھویں جماعت میں تھا اسی وقت سوامی سوم دیو جی سرسوتی آریہ سماج شاہ جہاں پور آئے۔ ان کی تقریروں کا عوام پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ کچھ لوگوں کے اصرار پر سوامی جی کچھ دنوں کے لیے شاہ جہاں پور کے آریہ سماج مندر میں ٹھہر گئے۔ سوامی جی کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی اس وجہ سے شاہ جہاں پور کی اچھی آب و ہوا دیکھ کر وہ وہاں ٹھہر گئے۔

میں ان کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ میں نے سوامی جی مہاراج کی بڑی خدمت کی اور اسی خدمت کے نتیجے میں میری زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔ میں رات کو دو تین بجے تک اور دن بھر ان کی خدمت کرتا رہا۔ مختلف طرح کی دوائیوں کو آزمایا۔ کچھ لوگوں نے

بڑی ہمدردی دکھائی مگر مرض دور نہ ہو سکا۔ سوامی جی مجھے کئی طرح کی نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ میں اُن کی نصیحتیں سن کر اُن پر عمل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ حقیقت میں وہ میرے گرودیو اور رہنما تھے۔ ان کی تعلیمات نے میری زندگی میں روحانی طاقت پیدا کی جس کے بارے میں الگ سے بیان کروں گا۔

کچھ نوجوانوں نے مل کر آریہ سماج مندر میں آریہ کمار سبھا کھولی تھی جس کے ہفتہ وارانہ اجلاس ہر جمعہ کو ہوا کرتے تھے۔ وہیں مذہبی کتابوں کا مطالعہ، خاص موضوع پر مضمون نویسی اور بلند خوانی اور بحث و مباحثہ ہوتے تھے۔ کمار سبھا ہی سے میں نے عوام کے سامنے بولنے کی مشق کی۔ اکثر کمار سبھا کے نوجوان مل کر شہر کے میلوں میں تبلیغ کرنے جایا کرتے تھے۔ بازاروں میں تقریریں کر کے آریہ سماج کے اصولوں کی تشہیر کرتے تھے۔ ایسا کرتے کرتے مسلمانوں سے بحث ہونے لگی۔ اس لیے پولیس نے جھگڑے کا خطرہ دیکھ کر بازاروں میں تقریروں کو بند کر دیا۔ آریہ سماج کے ممبروں نے کمار سبھا کی کوششوں کو دیکھ کر اس پر اپنا غلبہ جمانا چاہا لیکن نوجوان کسی کا ناجائز غلبہ کب برداشت کرنے والے تھے۔ آریہ سماج کے مندر میں تالا ڈال دیا گیا تاکہ کمار سبھا والے آریہ سماج مندر میں اجلاس نہ کر سکیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر وہ وہاں اجلاس کریں گے تو پولیس کو بلوا کر انھیں مندر سے نکلوا دیا جائے گا۔ کئی ماہ تک ہم لوگ میدان میں اپنی سبھا کے اجلاس کرتے رہے لیکن بچے ہی تو تھے کب تک اس طرح کام چلا سکتے تھے؟ کمار سبھا ٹوٹ گئی۔ تب آریہ ساجیوں کو اطمینان ہوا۔

جب لکھنؤ میں کانگریس ہوئی تو آل انڈیا کمار سبھا کا سالانہ اجلاس بھی وہیں ہوا۔ اس موقعہ پر سب سے زیادہ انعامات لاہور اور شاہ جہاں پور کی کمار سبھاؤں نے حاصل کیے تھے جس کی اخبارات نے بھی تعریف کی۔ انھیں دنوں مشن اسکول کے ایک طالب علم سے میرا تعارف ہوا۔ وہ کبھی کبھی کمار سبھا میں آیا کرتے تھے۔ میری گفتار کا ان پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ ویسے وہ میرے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ لیکن آپس میں کوئی میل نہ تھا۔ اُٹھنے بیٹھنے سے آپس میں محبت بڑھ گئی۔ وہ ایک گاؤں کے باشندے تھے۔ جس گاؤں میں ان کا گھر تھا وہ گاؤں بہت مشہور تھا۔ وہاں کا ہر باشندہ اپنے گھر میں بغیر لائسنس کا ہتھیار رکھتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے یہاں بندوقیں اور طمنچے بھی رہتے ہیں جو گاؤں ہی میں بن جاتے ہیں۔ یہ سب ٹوپی دار ہوتے ہیں۔ ان کے

پاس بھی ایک نالی کا چھوٹا سا پستول تھا جسے وہ اپنے ساتھ شہر میں رکھتے تھے۔ جب مجھ سے زیادہ محبت بڑھی تو انھوں نے مجھے وہ پستول رکھنے کے لیے دیا۔ اس طرح کے ہتھیار رکھنے کی میری خواہش بھی تھی کیوں کہ میرے والد کے کئی دشمن تھے جنھوں نے والد صاحب پر لاٹھیوں سے حملہ کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر پستول مل جائے تو میں والد صاحب کے دشمنوں کو مار ڈالوں۔ یہ ایک نالی کا پستول وہ اپنے پاس رکھتے تو تھے لیکن اس کو چلا کر نہ دیکھا تھا۔ میں نے اُسے چلا کر دیکھا تو وہ بالکل بے کار ثابت ہوا۔ میں نے اُسے لے جا کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اُن سے اتنی اُنسیت بڑھی کہ شام کو میں اپنے گھر سے کھیر کی تھالی لے جا کر ان کے ساتھ ساتھ ان کے مکان ہی پر کھانا کھایا کرتا تھا۔

وہ میرے ساتھ شری سوم دیو جی کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ ان کے والد جب شہر آئے تو انھیں یہ بہت بُرا لگا۔ انھوں نے مجھ سے اپنے لڑکے کے پاس نہ آنے یا اس کو کہیں ساتھ لے جانے کے لیے بہت بُرا بھلا کہا اور کہا کہ اگر میں اُن کا کہنا نہ مانوں گا تو وہ گاؤں سے آدمی لا کر مجھے پٹوا دیں گے۔ میں نے ان کے پاس آنا جانا ترک کر دیا لیکن وہ میرے یہاں آتے جاتے رہے۔

تقریباً اٹھارہ سال کی عمر تک میں ریل پر نہ چڑھا تھا۔ میں اتنا سخت حق گو ہو گیا تھا کہ ایک بار ریل پر بیٹھ کر تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدا تھا لیکن انٹر کلاس میں بیٹھ کر دوسروں کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔ اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ ایک طرح کی چوری ہے۔ سب کو مل کر انٹر کلاس کا کرایہ اسٹیشن ماسٹر کو دے دینا چاہیے۔ ایک بار میرے والد دیوانی میں کسی پر دعویٰ کر کے وکیل سے کہہ گئے تھے کہ جو کام ہو وہ مجھ سے کرالیں۔ ضرورت پڑنے پر وکیل صاحب نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ والد صاحب کے دستخط وکالت نامے پر کر دوں۔ میں نے فوراً جواب دیا یہ تو دھرم کے خلاف ہوگا اس طرح کا گناہ میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ وکیل صاحب نے بہت سمجھایا کہ سو روپے سے زیادہ کا دعویٰ ہے مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ لیکن مجھ پر قطعاً اثر نہ ہوا اور نہ میں نے دستخط ہی کیے۔ اپنی زندگی میں ہمیشہ سچ کی تقلید کرتا تھا چاہے کچھ ہو جائے سچ بات کہہ دیتا تھا۔

میری والدہ میرے مذہبی کاموں اور تعلیم وغیرہ میں بڑی مدد کیا کرتی تھیں۔ وہ عام طور پر صبح سویرے چار بجے ہی مجھے جگا دیا کرتی تھیں۔ میں ہر روز پابندی سے ہون کیا کرتا تھا۔ میری چھوٹی بہن کی شادی کرنے کے لیے والدہ اور والد گوالیار گئے۔ میں

اور دادی جان شاہ جہاں پور ہی میں رہ گئے کیوں کہ میرا سالانہ امتحان تھا۔ امتحان ختم کر کے میں بھی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے لیے گیا۔ بارات آچکی تھی۔ مجھے گاؤں کے باہر ہی معلوم ہو گیا کہ بارات میں طوائف آئی ہے۔ میں نہ گھر میں گیا اور نہ شادی میں شریک ہوا۔ میں نے شادی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ میں نے والدہ صاحبہ سے تھوڑے روپے مانگے۔ والدہ صاحبہ نے مجھے 125 روپے دیے جن کو لے کر میں گوالیار گیا۔ یہ ریوالور خریدنے کا اچھا موقعہ تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ریاست میں بڑی آسانی سے ہتھیار مل جاتے ہیں۔ بڑی تلاش کی۔ ٹوپی دار بندوق اور پستول تو ملتے تھے لیکن کارتوسی ہتھیاروں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پتہ لگا بھی تو ان حضرت نے مجھے ٹھگ لیا اور 75 روپے میں ٹوپی دار پانچ فائر کرنے والا ایک ریوالور دیا۔ ریاست کی بنی ہوئی بارود اور تھوڑی سی ٹوپیاں دے دیں۔ میں اسی کو لے کر بہت خوش ہوا۔ سیدھا شاہ جہاں پور پہنچا ریوالور کو بھر کر چلایا تو گولی صرف پندرہ یا بیس گز پر ہی گری کیوں کہ بارود اچھی نہ تھی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ والدہ صاحبہ بھی جب لوٹ کر شاہ جہاں پور آئیں تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا لائے؟ میں نے کچھ کہہ کر ٹال دیا۔ روپے سب خرچ ہو گئے تھے۔ شاید ایک گنّی بچی تھی وہ میں نے والدہ صاحبہ کو لوٹا دی۔

مجھے جب کسی کام کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو میں والدہ صاحبہ سے کہتا اور وہ میری مانگ پوری کر دیتی تھیں۔ میرا اسکول گھر سے ایک میل دور تھا۔ میں نے والدہ صاحبہ سے درخواست کی کہ مجھے سائیکل لے دیں۔ انھوں نے تقریباً ایک سو روپے دے دیے۔ میں نے سائیکل خرید لی۔ اس وقت میں انگریزی کی نویں جماعت میں آگیا تھا۔ کسی مذہبی یا ملک سے متعلق کتاب پڑھنے کی خواہش ہوتی تو والدہ صاحبہ ہی سے پیسے لے جاتا۔ لکھنؤ کانگریس جانے کے لیے میری بڑی خواہش تھی دادی جان اور والد صاحب تو بہت مخالفت کرتے رہے لیکن والدہ صاحبہ نے مجھے خرچ دے ہی دیا۔ اسی وقت شاہ جہاں پور میں سیوا سمیتی کا آغاز ہوا تھا۔ میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ سیوا سمیتی میں تعاون کرتا تھا۔ والد صاحب اور دادی جان کو میرے اس طرح کے کام اچھے نہ لگتے تھے لیکن والدہ صاحبہ میرا جوش ختم نہ ہونے دیتی تھیں جس کی وجہ سے انھیں اکثر والد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ اور سزا بھی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ حقیقت میں میری والدہ ایک سورگیہ دیوی ہیں۔ مجھ میں جو کچھ زندگی اور حوصلہ پیدا ہوا وہ میری

والدہ اور گرودیو شری سوم دیو جی کی عنایات ہی کا نتیجہ ہے۔ دادی جان اور والد صاحب میری شادی کے لیے بہت ضد کرتے لیکن والدہ صاحبہ یہی کہتیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی شادی کرنا مناسب ہوگا۔ والدہ کی ہمت افزائی اور اچھے سلوک نے میری زندگی میں وہ استحکام پیدا کیا کہ کسی مصیبت یا پریشانی آنے پر میں نے اپنے عزم کو نہ چھوڑا۔

میری ماں

گیارہ سال کی عمر میں والدہ صاحبہ بیاہ کر شاہ جہاں پور آئی تھیں۔ اس وقت وہ بالکل ناخواندہ اور دیہی لڑکی کی طرح تھیں۔ شاہ جہاں پور آنے کے تھوڑے دنوں بعد دادا جان نے اپنی چھوٹی بہن کو بلا لیا۔ انھوں نے والدہ کو امور خانہ داری کا سلیقہ سکھایا۔ تھوڑے دنوں بعد والدہ صاحبہ نے گھر کے سب کام کاج کو سمجھ لیا اور کھانے وغیرہ کا ٹھیک ٹھیک انتظام کرنے لگیں۔ میرے پیدا ہونے کے پانچ یا سات سال بعد انھوں نے ہندی پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے کا شوق انھیں خود ہی پیدا ہوا تھا۔ محلے کی جو سہیلیاں گھر پر آیا کرتی تھیں انھیں میں جو تعلیم یافتہ تھیں والدہ صاحبہ اُن سے حروف شناسی کرتیں۔ اس طرح گھر کا سب کام کر چکنے کے بعد جو کچھ وقت مل جاتا اس میں پڑھنا لکھنا کرتیں۔ محنت کے ثمر سے تھوڑے ہی دنوں میں وہ دیوناگری کتابوں کا مطالعہ کرنے لگیں۔ میری بہنوں کو چھوٹی عمر میں والدہ صاحبہ ہی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ جب سے میں نے آریہ سماج میں داخلہ لیا تب سے والدہ صاحبہ سے خوب بحث و مباحثہ ہوتا۔ اس وقت کی نسبت اب اُن کے خیالات بھی وسیع ہو گئے ہیں۔ اگر مجھے ایسی والدہ نہ ملتیں تو میں بھی ایک معمولی انسان کی طرح دنیاوی چکر میں پھنس کر زندگی گزار دیتا۔ تعلیم وغیرہ کے علاوہ انقلابی زندگی میں بھی انھوں نے میری ویسی ہی مدد کی جیسی میزینی (5) کی اُن کی والدہ نے کی تھی آگے چل کر میں ان سب باتوں کا ذکر کروں گا۔ والدہ صاحبہ کا میرے لیے سب سے بڑا حکم یہی تھا کہ کسی کا جانی نقصان نہ ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنے دشمن کو بھی کبھی موت کی سزا نہ دینا۔ ان کے اس حکم کی تکمیل کے لیے مجھے مجبوراً دو ایک بار اپنا عہد بھی توڑنا پڑا۔

زندگی دینے والی ماں! اس زندگی میں تو تمھارا قرض اتارنے کی کوشش کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ اس جنم میں تو کیا اگر مختلف جنموں میں بھی تمام زندگی کوشش کروں تو بھی تمھارا قرض نہیں اُتار سکتا۔ جس محبت اور عزم کے ساتھ تم نے اس حقیر زندگی

[illegible] کی اصلاح کی [illegible] ہے۔ مجھے زندگی کا یہ وقت یاد ہے کہ تم نے فرشتوں کی طرح میری اصلاح کی۔ [illegible] [illegible] سے میں نے [illegible] زندگی میں بھی [illegible] سے [illegible]۔ جو کچھ تعلیم میں نے حاصل کی اس کا سہرا بھی [illegible] کے سر ہے۔ جس موثر انداز سے تم مجھے نصیحتیں کیا کرتی تھیں ان کو یاد کر کے [illegible] [illegible] اگر تم نے [illegible] تو [illegible] کو [illegible] اگر میں نے [illegible] بھی تم نے [illegible] لفظوں میں بھی کہا کہ تمہیں جو اچھا لگے وہ کرو لیکن ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کا نتیجہ [illegible] زندگی [illegible] جسم کو [illegible] کہ صرف [illegible] روحانی [illegible] نشوونما [illegible] میری [illegible]

[illegible] بھی تم نے مجھے [illegible] اپنی محبت بھری آواز سناتے ہوئے مجھے کہانی [illegible] نے اپنی زندگی بھر کوئی [illegible] محسوس نہیں کیا۔ اس دنیا میں مجھے [illegible] صرف [illegible] کی خدمت کر کے اپنی زندگی کو [illegible] میری موت کی [illegible] مجھے یقین ہے کہ تم [illegible] کی خدمت میں اپنی زندگی کو قربانی کی [illegible] جب آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کے کسی سطر پر [illegible] لفظوں میں [illegible] کے انتقال کی خبر سنی تو بہت خوش ہوئی تھیں [illegible] کے لیے [illegible] کی قربانی [illegible] کے آخری لمحات میں بھی [illegible] کی طرح [illegible] کو پیغام کر کے میں [illegible] کو یاد کرتے ہوئے اس دنیا سے کوچ کروں۔

[illegible]

[illegible] کے [illegible] زندگی اور تعلیم میں نے حاصل کی [illegible] محترم جناب 108 سال [illegible] کی [illegible] کا نتیجہ

ہے۔ آپ کا نام جناب برج لال چوپڑہ تھا۔ پنجاب کے لاہور شہر میں آپ کی پیدائش ہوئی تھی۔ آپ کا خاندان بہت مشہور تھا کیوں کہ آپ کے دادا مہاراجا رنجیت سنگھ کے وزیروں میں سے ایک تھے۔ آپ کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا آپ کی دادی نے آپ کی پرورش کی تھی۔ آپ اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے۔ جب آپ بڑے ہوئے تو چچاؤں نے دو تین بار آپ کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تاکہ ان کے لڑکوں کو ہی ساری جائیداد مل سکے۔ آپ کے چچا آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور تعلیم وغیرہ پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ آپ بھی انگریزی اسکول میں پڑھتے تھے۔ جب آپ نے انٹرنس کا امتحان دیا تو نتیجہ شائع ہونے پر آپ یونی ورسٹی میں اول آئے اور چچا کے لڑکے فیل ہو گئے۔ گھر میں بڑا ماتم منایا گیا۔ کھانا تک نہیں بنایا گیا۔ آپ کی تعریف تو درکنار کسی نے اس دن کھانا کھانے کو بھی نہ پوچھا اور بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھا۔ آپ کا دل پہلے ہی سے زخمی تھا۔ اس حادثے نے آپ کی زندگی کو اور بھی صدمہ پہنچایا۔

چچا کے کہنے سننے پر کالج میں نام تو لکھوالیا لیکن بڑے مایوس رہتے تھے۔ آپ کے دل میں رحم بہت تھا۔ اکثر اپنی کتابیں اور کپڑے دوسرے ہم جماعتوں کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ نئے کپڑے بانٹ کر پرانے کپڑے خود پہنا کرتے تھے۔ ایک دو بار چچا سے دوسرے لوگوں نے کہا کہ آپ برج لال کو کپڑے بھی بنوا کر نہیں دیتے جو وہ پرانے اور پھٹے کپڑے پہنے پھرتے ہیں۔ چچا کو بہت تعجب ہوا کیوں کہ انھوں نے تھوڑے دن پہلے ہی کئی جوڑی کپڑے بنوائے تھے۔ آپ کے صندوق کی تلاشی لی گئی۔ اس میں دو چار جوڑی پرانے کپڑے نکلے۔ جب چچا نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ نئے کپڑے نادار طالب علموں کو بانٹ دیا کرتے ہیں۔ چچا جان نے کہا کہ کپڑے بانٹنے کی خواہش ہو کہہ دیا کرو ہم طلباء کو کپڑے بنوا دیا کریں گے اپنے کپڑے نہ بانٹا کرو۔ آپ اکثر غریب طلباء کو اپنے گھر پر ہی کھانا کھلایا کرتے تھے۔ چچاؤں اور چچا زاد بھائیوں کے برتاؤ سے آپ کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے شادی نہیں کی۔ گھریلو برتاؤ سے پریشان ہو کر آپ نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ایک رات جب سب سو رہے تھے آپ خاموشی سے گھر سے نکل گئے۔ کوئی سامان ساتھ نہیں لیا۔ بہت دنوں تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ بھٹکتے بھٹکتے آپ ہری دوار پہنچے۔ وہاں ایک پہنچے ہوئے یوگی سے ملاقات ہوئی۔ شری برج لال جی کو جس چیز کی خواہش تھی وہ مل گئی۔ اس مقام پر رہ کر

انھوں نے یوگ ودیا کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ یوگی راج کی مہربانی سے آپ 20-18 گھنٹے کی سمادھی لگا لینے لگے۔ کئی سال تک آپ وہاں رہے۔ اس وقت آپ کو یوگ کی اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ اپنے جسم کو آپ اتنا ہلکا کر لیتے تھے کہ پانی پر زمین کی طرح چلے جاتے تھے۔ آپ کو اب ملک کی سیاحت اور حصول علم کی خواہش ہوئی۔ مختلف مقامات پر سیاحت کرتے ہوئے مطالعہ کرتے رہے۔ جرمنی اور امریکہ سے بہت سی کتابیں منگائیں جو شاستروں سے متعلق تھیں۔

جب لالہ لاجپت رائے کو جلاوطنی کی سزا ملی تھی اس وقت آپ لاہور میں تھے۔ وہاں آپ نے ایک اخبار کی ایڈیٹری کے لیے ڈیکلریشن داخل کیا۔ ڈپٹی کمشنر اس وقت کسی کے بھی اخبار کے ڈیکلریشن کو منظور نہ کرتا تھا۔ جب آپ سے ملاقات ہوئی تو بہت متاثر ہوا اور اس نے ڈیکلریشن منظور کر لیا۔ اخبار کا پہلا ہی اداریہ "انگریزوں کو تنبیہ" کے نام سے نکلا۔ مضمون اتنا بھڑ کیلا تھا کہ سب کاپیاں بک گئیں اور عوام کی فرمائش پر اسی شمارہ کو دوسری بار شائع کرنا پڑا۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس رپورٹ ہوئی۔ اس نے آپ کو دیکھنے کے لیے بلایا۔ اُسے بڑا غصہ تھا۔ مضمون کو پڑھ کر کانپتا اور غصے میں آ کر میز پر ہاتھ دے مارتا تھا۔ لیکن آخری لفظوں کو پڑھ کر چپ ہو جاتا تھا۔ اس مضمون کے کچھ الفاظ اس طرح تھے کہ "اگر انگریز اب بھی نہ سمجھیں گے تو وہ دن دور نہیں کہ سن 1857 کے نظارے پھر دکھائی دیں اور انگریزوں کے بچوں کو قتل کیا جائے ان کی عورتوں کی بے عزتی کی جائے وغیرہ لیکن یہ سب خواب ہے۔" "یہ سب خواب ہے۔" انھیں الفاظ کو پڑھ کر ڈپٹی کمشنر کہتا کہ ہم تمھارا کچھ نہیں کر سکتے۔

سوامی سوم دیو سیاحت کرتے ہوئے بمبئی جا پہنچے۔ وہاں آپ کی تقاریر کا عوام پر بہت اثر ہوا۔ ایک آدمی جو جناب ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی تھے آپ کی تقریروں کو سن کر بہت متاثر ہوئے۔ وہ آپ کو اپنے گھر لے گئے۔ اس وقت تک آپ نے گیروے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ صرف ایک لنگی اور کرتا پہنتے تھے اور صافہ باندھتے تھے۔ جناب ابوالکلام آزاد کے اجداد عرب کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کے بمبئی میں بہت سے عقیدت مند تھے اور وعظ کہنے پر ہزاروں روپے کا نذرانہ آیا کرتا تھا۔ وہ حضرت اتنے فریفتہ ہوئے کہ وعظ میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ دن رات آپ کے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ جب آپ ان سے کہیں جانے کو کہتے تو وہ رونے لگتے اور کہتے کہ میں تو آپ کے روحانی علم (روح سے متعلق معلومات) کی تقاریر پر فریفتہ ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی

ت کی خواہش تھی۔ آپ نے ایک دن مداخلت ہو کر ان کو حجرے سے نکال دیا جس سے وہ دن بھر روتے رہے۔ جب ان کے گھر والوں اور شاگردوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ کچھ نہ سمجھے تھے۔ یہ دیکھ کر ان کے شاگردوں کو بہت غصہ آیا کہ وہ سوامی جی کے قتل میں گھس گئے۔ ایک شام کو سوامی جی کے ساحل سمندر پر گھومنے گئے کہ کسی طرح حالات پر قابو پا کر سوامی جی کو ملاقات کے لیے آسکے۔ یہ خبر سن کر انہوں نے سوامی جی کی جان کا خطرہ کہہ کر سوامی جی سے [illegible] دوست کی صبح سویرے ایک کشتی پر سوامی جی کو چڑھا کر آپ کے صرف ابوالکلام آزاد کے [illegible] صاحب نے خودکشی کر لی۔ جب آکر آپ بہت رنجیدہ ہوئے۔ جس وقت آپ کو یہ باتیں یاد آجاتی تھیں تو بہت رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ایک شام میں آپ کے قریب بیٹھا تھا کافی دیر اکیلا کیا تھا۔ سوامی جی نے بڑی گہری ٹھنڈی سانس لی۔ میں نے چہرے کی طرف دیکھا تو آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کئی گھنٹے درخواست کی تب آپ نے مندرجہ بالا تفصیل بتائی۔

آپ کو انگریزی میں بڑی مہارت تھی۔ شاعروں کا علم بھی آپ کا بہت وسیع تھا۔ آپ بے خوف مقرر تھے۔ آپ کی قابلیت کے پیش نظر مدراس کی کانگریس کمیٹی نے آپ کو آل انڈیا کانگریس کا نمائندہ منتخب کر کے بھیجا تھا۔ آریہ دھرم سبھا کے سالانہ جلسے پر آپ کی تقریر کو سن کر راجا مہندر پرتاپ صاحب بڑے متاثر ہوئے۔ راجا صاحب نے آپ کے پاؤں چھوئے اور آپ کو اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ اس وقت سے راجا صاحب اکثر آپ کے لیکچر سنا کرتے اور آپ کو اپنا گرو مانتے تھے۔ اتنا صاف اور بے خوف مقرر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ 1913 میں میں نے آپ کی پہلی تقریر شاہجہاں پور میں سنی تھی۔ آریہ سماج کے سالانہ جلسے میں آپ تشریف لائے تھے۔ اس وقت آپ بریلی میں سکونت پذیر تھے۔ آپ کا جسم بہت ڈھیلا تھا کیوں کہ آپ کو ایک عجیب بیماری لگ گئی تھی۔ آپ جب پاخانے جاتے تھے تب آپ کے خون گرتا تھا۔ کبھی دو چھٹانک، کبھی پاؤ چھٹانک اور کبھی کبھی تو ایک سیر تک خون گر جاتا تھا۔ ہمیشہ آپ کو شکایت تھی۔ ایسا کہتے تھے کہ کسی طرح بچپن کے کھیل کے جانے سے پیٹ کی آنت میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ آنت سڑ گئی۔ بعد چند روز کر آنت کو کاٹ ڈالا۔ اسی وقت سے یہ بیماری لگ گئی۔ بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوائیاں کیں لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اتنے کمزور ہونے پر بھی جب تقریر کرتے تب گھنٹوں

سے بولتے کہ تین چار فرلانگ سے آپ کی تقریر صاف سنائی دیتی تھی۔ دو تین سال تک آپ کو ہر سال آریہ سماج کے سالانہ جلسے پر بلایا جاتا۔ 1915 میں کچھ لوگوں کی درخواست پر آریہ سماج مندر شاہ جہاں پور میں ہی رہنے لگے۔ اسی وقت سے میں نے اُن کی خدمت گزاری کرنا شروع کر دی۔

سوامی جی مجھے مذہبی اور سیاسی اُپدیش دیتے تھے اور اسی طرح کی کتابیں بھی پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ سیاست میں بھی آپ کی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ لالہ ہردیال سے آپ کا صلاح مشورہ ہوتا تھا۔ ایک بار مہاتما منشی رام جی (مرحوم سوامی شردھانند) کو آپ نے پولیس کے عتاب سے بچایا۔ آپ کو آچاریہ رام دیو جی اور شری کرشنا جی سے بڑی محبت تھی۔ سیاست کے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ نہ کھلتے تھے۔ آپ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد یورپ کا سفر ضرور کرنا۔ اٹلی جا کر مہاتما "میزینی (5) کی جائے پیدائش کا دیدار ضرور کرنا۔ 1916 میں لاہور سازش کا معاملہ چلا۔ میں اخبارات میں اس کی سب تفصیل شوق سے پڑھتا تھا۔ شری بھائی پرمانند جی (6) سے مجھے بڑی عقیدت تھی کیوں کہ ان کی لکھی ہوئی "تواریخ ہند" پڑھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا تھا۔ بھائی پرمانند جی کو پھانسی کی سزا پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی (6) میں نے سوچا انگریز بڑے ظالم ہیں ان کی ریاست میں انصاف نہیں ہے جو اتنے عظیم انسان کو پھانسی کی سزا کا حکم دے دیا۔ میں نے عہد کیا کہ اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ زندگی بھر انگریزی حکومت کو برباد کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

اس طرح کا عہد کر لینے کے بعد میں سوامی جی کے پاس آیا۔ تمام خبریں سنائیں اور اخبار دیا۔ اخبار پڑھ کر سوامی جی بہت رنجیدہ ہوئے۔ تب میں نے اپنے عہد کے بارے میں بتایا۔ سوامی جی کہنے لگے کہ عہد کرنا آسان ہے لیکن اس پر مستحکم رہنا مشکل ہے۔ میں نے سوامی جی کو سلام کر کے جواب دیا کہ اگر آپ کے قدموں کی مہربانی ہو گی تو عہد کی تکمیل میں کوئی کمی نہ کروں گا۔ اس دن سے سوامی جی کچھ کچھ کھلے۔ آپ بہت سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اسی دن سے میری انقلابی زندگی کا آغاز ہوا۔ اگرچہ آپ آریہ سماج کے اصولوں کو سب سے افضل مانتے تھے لیکن پرم ہنس رام کرشن، سوامی وویکا آنند، سوامی رام تیرتھ اور مہاتما کبیر داس کے اُپدیشوں کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔

مذہبی اور روحانی زندگی میں جو استحکام مجھ میں پیدا ہوا وہ سوامی جی مہاراج کے اُپدیشوں ہی کا نتیجہ ہے۔ آپ کی مہربانی ہی سے میں برہم چریہ کی پابندی میں کامیاب ہوا۔ آپ نے میرے مستقبل کے بارے میں جو جو باتیں کہیں تھیں وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔ آپ کہا کرتے تھے کہ دکھ ہے کہ یہ جسم نہ رہے گا اور تیری زندگی میں عجیب عجیب مسائل پیدا ہوں گے جن کو حل کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔ اگر یہ جسم برباد نہ ہوا، جو نا ممکن ہے تو تیری زندگی بھی دنیا میں مثالی زندگی ہو گی۔ میری بد قسمتی تھی کہ جب آپ کے آخری دن بہت قریب آگئے تب آپ نے مجھے یوگا سے متعلق کچھ مشقیں بتانے کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ ذرا سی محنت کرنے یا دس بیس قدم چلنے پر ہی آپ پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ آپ پھر کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ کچھ دیر بیٹھ کر کچھ مشقیں مجھے بتا سکیں۔ آپ نے کہا تھا کہ میرا یوگ خراب ہو گیا۔ کوشش کروں گا مرتے وقت پاس رہنا مجھ سے پوچھ لینا کہ میں کہاں جنم لوں گا۔ ممکن ہے میں بتا سکوں۔ روز بروز سیر آدھا سیر خون گر جانے پر بھی آپ کبھی بھی پریشان نہیں ہوتے تھے۔ آپ کی آواز بھی کبھی کمزور نہ ہوئی۔ جیسے لاثانی آپ مقرر تھے ایسے ہی آپ مصنف بھی تھے۔ آپ کے کچھ مضامین اور کتابیں سوامی انو بھو آنند جی شانت لے گئے تھے۔ کچھ مضامین آپ نے شائع بھی کرائے تھے۔ تقریباً 48 برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس مقام پر میں مہاتما کبیر کے کچھ اصول اقوال کا ذکر کرتا ہوں جو مجھے بڑے پیارے اور تعلیم دینے والے معلوم ہوئے۔

کبیرا شریر سرائے ہے بھاڑا دے کے بس
جب بھٹیاری خوش رہے تب جیون کا رس
کبیرا اچھو دھا ہے کو کری کرت بھجن میں بھنگ
یا کو نکر اڈاری کے سو سیرن کرو نیشنک
نیند نساری میچ کی اُٹھ کبیرا جاگ
اور رسائن تیاگ کے نام رسائن چاکھ

چلنا ہے رہنا نہیں چلنا بیسویں ہیں
کبیرا ایسے سہاگ پر کون بندھاوے سیس
اپنے اپنے چور کو سب کوئی ڈارے ماری
میرا چور جو مو ہیں ملے سب رس ڈاروں واری
کہے سنے کی ہے نہیں دیکھا دیکھی بات
دولھا دلہن ملی گئے سونی پری برات
نین کی کری کوٹھری پتری پلنگ بچھائے
پلکن کی چک ڈاری کے پیتم لیہہ لبے رجھائے
پریم پیالہ جو پیئے سیس دچھنا دے
لو بھی سیس نہ دے سکے نام پریم کا لے
سیس اُتارے بھوئیں دھرے تاپے راکھے پاؤں
داس کبیرا یوں کہے ایسا ہوئے تو آؤ
نندک نیرے راکھیئے آنگن کٹی چھبائے
بن پانی صابن بنا نرمل کرے سبھائے

(برہم چریہ ورت کی پابندی) تجردانہ زندگی کی پابندی

دورِ جدید میں اس ملک کی کچھ ایسی خراب حالت ہو رہی ہے کہ جتنے صاحب ثروت اور معزز افراد ہیں ان میں سے 99 فی صد ایسے ہیں جو اپنی اولاد جیسی بیش قیمت دولت کو اپنے نوکر اور نوکرانیوں کے ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں ان کی جیسی مرضی ہو ویسا انھیں بنائیں۔ متوسط طبقے کے افراد بھی اپنے پیشہ اور نوکری وغیرہ میں مصروف رہنے کی وجہ سے اولاد کی طرف زیادہ توجہ نہیں

دے سکتے سستا کام چلاؤ نوکر یا نوکرانی رکھتے ہیں اور انھیں ہی بال بچوں کی ذمے داری سونپ دیتے ہیں یہ نوکر بچوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ اگر کچھ خدا کی مہربانی ہو گئی اور بچے نوکر نوکرانیوں کے ہاتھ سے بچ گئے تو محلے کی گندگی سے بچنا بڑا مشکل ہے۔ رہے سہے اسکول پہنچ کر استاد ہو جاتے ہیں۔ کالج پہنچتے پہنچتے آج کل کے نوجوان ہر عیب میں ماہر ہو جاتے ہیں۔

کالج میں پہنچ کر یہ لوگ اخبارات میں دیے ہوئے دوائیوں کے اشتہارات دیکھ دیکھ کر اور انھیں منگا کر اپنی دولت برباد کرتے ہیں۔ 95فی صد کی آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کچھ کو جسمانی کمزوری اور کچھ کو فیشن کے اعتبار سے عینک لگانے کی بری عادت پڑ جاتی ہے۔ حسن پرستی تو ان کی نس نس میں کوٹ کوٹ کر بھر جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جس کے عشقیہ قصے عام نہ ہوں۔ ایسی عجیب و غریب باتیں سننے میں آتی ہیں کہ جن کا ذکر کرنے سے بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اگر کوئی طالب علم باکردار بننے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اسکول یا کالج میں اُسے اچھی تعلیم بھی مل جاتی ہے تو بھی حالات جن سے ہو کر اُسے گزرنا پڑتا ہے اُسے اصلاح کا موقع نہیں دیتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ تھوڑا سا اس زندگی کا بھی لطف لے لیں اگر کچھ خرابی پیدا ہو گئی تو دوائی کھا کر یا مقویات استعمال کر کے اس کمی کو دور کر لیں گے۔ یہ اُن کی سب سے بڑی نادانی ہے۔ انگریزی کی کہاوت ہے ''اونلی فار ونس اینڈ فار ایور'' (Only for once and for ever)۔

راز یہ ہے کہ اگر ایک بار کوئی بات پیدا ہو گئی تو سمجھ لو ہمیشہ کے لیے راستہ کھل گیا۔ دوائیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ انڈوں کا جوس، مچھلی کا تیل اور گوشت وغیرہ سب بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے ضروری بات ہے اصلاح کردار۔ طلباء اور ان کے اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملک کی بدحالی پر کرم فرما کر اپنے کردار کی اصلاح کی کوشش کریں۔ مختصراً تجرد ہی دنیاوی طاقت کی بنیاد ہے بغیر تجردانہ زندگی کے انسانی زندگی بے کیف اور خشک سی محسوس ہوتی ہے۔ علم، قوت اور ذہانت سب تجرد ہی کے طفیل سے حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا میں جتنے عظیم انسان ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ تر تجرد ہی کی وجہ سے عظیم بنے ہیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں سال بعد بھی اُن کی ثناخوانی کر کے انسان خود اپنے آپ پر احسان کرتا ہے۔ تجرد کی عظمت کے بارے میں اگر جاننا ہے تو پرشورام، رام، لکشمن، بھیشم، عیسیٰ، میزینی، بندہ رام کرشن، دیانند اور رام مورتی کی سوانح حیات کا مطالعہ کرو۔

جن طلباء کو بچپن میں کوئی بری عادت پڑ جاتی ہے۔یا کسی بُری صحبت میں پڑ کر وہ اپنے کردار کو داغدار بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اچھی تعلیم پانے پر کردار کے اصلاح کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوپاتے انھیں بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسانی زندگی ریاضت کا ایک مجموعہ ہے۔انسانی ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں سے جو اُسے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اُن پر پہلے عمل کرتا ہے۔ عمل کے بار بار دہرانے سے خواہشات اور جذبات نکل جاتے ہیں اور اُن میں فوری ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔ان فوری ترغیبی اعمال کو، جو اعادہ کا ثمر ہیں ریاضت کہتے ہیں۔انسانی کردار اسی ریاضت سے تشکیل پاتا ہے۔

ریاضت سے مراد عادت اور مزاج وغیرہ سے ہے۔ریاضت اچھی اور بری دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ اگر ہمارے ذہن میں مسلسل اچھے خیالات پیدا ہوں تو اُن کا ثمر اچھی ریاضت ہوگی اور اگر ذہن میں بُرے خیالات ہی موجزن ہوں تو یقیناً ریاضت بھی بُری ہی ہوگی۔ ذہن خواہشات کا مرکز ہے۔ انھیں کی تکمیل کے لیے انسان کو کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ ریاضتوں کے بننے میں موروثی تجربات یعنی والدین کی ریاضتوں کے مطابق تقلیدی بچوں کی ریاضت میں مددگار ہوتی ہے۔ دوسرے، جیسے حالات میں زندگی گزارتا ہے ویسی ہی ریاضت ہوتی ہے۔ تیسرے، کوششوں سے بھی ریاضت تشکیل پاتی ہے۔ یہ قوت اتنی مضبوط ہو سکتی ہے کہ اس کے ذریعے انسان موروثی دنیا اور حالات پر بھی فتح یاب ہو سکتا ہے ہماری زندگی کا ہر فعل ریاضت کے تحت ہے۔ اگر ریاضت کے ذریعے ہمیں کام میں سہولت نہ محسوس ہو تو ہماری زندگی بڑی دکھ بھری محسوس ہو۔ لکھنے کی مشق، کپڑے پہننے، درس و تدریس وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ اگر ہمیں ابتدائی دور کی طرح ہمیشہ ہوشیاری سے کام لینا ہو تو کتنی دشواری محسوس ہو۔اسی طرح بچے کا کھڑا ہونا اور چلنا بھی ہے کہ اُس وقت وہ کتنی تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن ایک انسان میلوں تک چلا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تو چلتے چلتے نیند لے لیتے ہیں۔ جیسے جیل میں باہری دیوار پر گھڑی میں چابی دینے والے۔ جنھیں برابر چھ گھنٹے چلنا ہوتا ہے وہ اکثر چلتے چلتے سولیا کرتے ہیں۔

ذہنی جذبات کو پراگندگی سے بچاتے ہوئے ضمیر کو اعلیٰ خیالات میں بزور طاقت مصروف کرنے کی ریاضت کرنے سے یقیناً

کامیابی ملے گی۔ ہر طالب علم اور نوجوان کو جو مجردانہ زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے لازم ہے کہ اپنے روزمرہ کے معمول کا تعین کرے۔ کھانے پینے وغیرہ پر خصوصی توجہ دے۔ مہاتماؤں کی سوانح حیات اور کردار کا مطالعہ کرے۔ پیار محبت اور ناولوں میں وقت ضائع نہ کرے۔ خالی اوقات تنہا نہ گزارے۔ جس وقت بُرے خیالات دل میں آئیں فوراً ٹھنڈا پانی پی کر گھومنے لگے یا اپنے سے بڑے کے پاس جاکر بات چیت کرنے لگے۔ فحش اشعار، غزلیں اور گانوں کو نہ پڑھے اور نہ سنے۔

طالب علم صبح سویرے طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے بستر چھوڑ دے، حوائج ضروری سے فراغت پائے اور کسرت کرے یا ہوا خوری کے لیے باہر جائے۔ سورج نکلنے کے پانچ دس منٹ پہلے غسل سے فارغ ہو کر عقیدے کے مطابق خدا کی عبادت کرے۔ ہمیشہ کنویں کے تازے پانی سے غسل کرے۔ اگر کنویں کا پانی دستیاب نہ ہو تو سردیوں میں پانی کو تھوڑا گنگنا کرلے گرمیوں میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرے۔ نہانے کے بعد ایک کھردرے تولیے سے یا انگوچھے سے جسم کو خوب ملے۔ عبادت کے بعد تھوڑا ناشتہ کرے۔ کوئی پھل خشک میوہ دودھ وغیرہ یا سب سے اچھا یہ ہے کہ گیہوں کا دلیہ چینی یا نمک ملا کر کھائے۔ پھر مطالعہ کرے اور دس سے گیارہ بجے کے درمیان کھانا کھالے۔ کھانے میں گوشت، مچھلی، چٹ پٹے، کھٹے، بھاری اور باسی اور جذبات بھڑکانے والی چیزوں کا استعمال نہ کرے۔

پیاز، لہسن، لال مرچ، آم کی کھٹائی اور زیادہ مسالے دار کھانا کبھی نہ کھائے۔ سادہ کھانا کھائے۔ خشک کھانے سے بھی پرہیز کرے۔ جہاں تک ہو سکے ساگ سبزی زیادہ کھائے۔ کھانا خوب چبا چبا کر کھائے۔ زیادہ گرم یا زیادہ ٹھنڈا کھانا بھی منع ہے۔ اسکول یا کالج سے آکر تھوڑا سا آرام کر کے ایک گھنٹہ لکھنے کا کام کر کے کھیلنے کے لیے جائے میدان میں تھوڑا سا گھومے بھی۔ گھومنے کے لیے چوک بازار کی گندی ہوا میں جانا مناسب نہیں۔ صاف ہوا لیں۔ شام کے وقت بھی پاخانے کے لیے ضرور جائیں۔ تھوڑی سی عبادت کر کے ہلکا سا ناشتہ کرلیں۔ رات کے وقت دس بجے تک لکھنا پڑھنا کریں اور پھر سو جائیں۔ ہمیشہ کھلی ہوا میں سونا چاہیے۔ بہت ملائم اور چکنے بستر پر نہ سوئیں۔ زیادہ نہ پڑھنا ہو تو ساڑھے نو یا دس بجے سو جائیں۔ صبح سویرے ساڑھے تین یا چار بجے اُٹھ کر کلی کر کے ٹھنڈا پانی پئیں اور حوائج ضروری سے فراغت پا کر پڑھائی کریں سورج نکلنے سے پہلے پھر روز کی طرح کسرت یا سیر

کریں۔ کسرت میں ڈنڈ بیٹھک سب سے اچھی ہے۔ جہاں جی چاہے کسرت کرلو۔ پروفیسر صاحب کا طریقہ طلباء کے لیے فائدہ مند ہے اس لیے پروفیسر رام مورتی کے طریقے سے ڈنڈ بیٹھک کریں۔ تھوڑے وقت ہی میں کافی محنت ہو جاتی ہے۔ ڈنڈ بیٹھک کے علاوہ شیش آسن اور پدماسن کی بھی کسرت کرنا چاہیے اور اپنے کمروں میں بہادروں اور مہاتماؤں کی تصاویر لگانی چاہیے۔

باب دوم

حب الوطنی

محترم سوامی دیو کا انتقال ہو جانے کے بعد جب میں انگریزی کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا کچھ وطن پرستی سے متعلق کتابوں کا مطالعہ شروع ہوا۔ پنڈت شری رام باجپئی جی نے شاہجہاں پور میں سیوا سمیتی قائم کی۔ اس میں بھی بڑے جوش و خروش سے کام کیا۔ خدمت خلق کا جذبہ دل میں پیدا ہوا۔ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ حقیقت میں اہل وطن بہت دکھی ہیں۔ اسی سال میرے دوست اور پڑوسی جن سے مجھے خاص لگاؤ تھا انٹرنس پاس کر کے کالج میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ کالج کی آزاد فضا میں ان کے دل میں بھی وطن پرستی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اسی سال لکھنؤ آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا میں بھی اس میں شامل ہوا۔ مختلف معززین سے ملاقات ہوئی۔ ملک کی حالت کا کچھ اندازہ ہوا اور طے کیا کہ ملک کے لیے کچھ خاص کام کیا جائے۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار حکومت ہی ہے۔ ہندوستانیوں کے دکھ اور بدحالی کی ذمہ داری حکومت پر ہی ہے اس لیے حکومت کو پلٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے بھی اس طرح کے خیالات میں تعاون دیا۔ کانگریس میں لوک مانیہ تلک کے آنے کی خبر تھی جس کی وجہ گرم دل کے زیادہ لوگ آئے ہوئے تھے کانگریس کے صدر کا استقبال بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ اس کے دوسرے دن لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی اسپیشل گاڑی آنے کی اطلاع ملی۔ لکھنؤ اسٹیشن پر بڑی بھیڑ تھی۔ استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں سے معلوم ہوا کہ لوک مانیہ کا استقبال صرف اسٹیشن پر ہی کیا جائے گا اور شہر میں سواری نہیں نکالی جائے گی جس کا سبب یہ تھا کہ استقبالیہ کمیٹی کے صدر پنڈت جگت نرائن جی تھے۔ دوسرے معزز ممبران میں گورکھ ناتھ جی اور دوسرے اعتدال پسندوں (ماڈریٹوں) کی تعداد زیادہ تھی۔ ماڈریٹوں کو خطرہ تھا کہ اگر لوک مانیہ کی سواری شہر میں نکالی گئی تو کانگریس کے صدر سے بھی زیادہ

احترام ملے گا جسے وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔اس لیے ان سب نے بندوبست کیا کہ جیسے ہی لوک مانیہ تشریف لائیں انھیں موٹر میں بٹھا کر شہر کے باہر ہی باہر نکال لے جائیں۔ان تمام باتوں کو سن کر نوجوانوں میں بڑا غم و غصہ تھا۔کالج کے ایک ایم اے کے طالب علم نے اس بندوبست کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ لوک مانیہ کا استقبال ضرور ہونا چاہیے۔میں نے بھی اس طالب علم کی حمایت کی۔اس پر کئی نوجوانوں نے یہ طے کیا کہ جیسے ہی لوک مانیہ اسپیشل ریل گاڑی سے اتریں انھیں گھیر کر گاڑی میں بٹھا لیا جائے اور سواری نکالی جائے۔اسپیشل ریل گاڑی آنے پر لوک مانیہ سب سے پہلے اترے۔استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں نے کانگریس کے سوئم سیوکوں کا حصار بنا کر لوک مانیہ کو لے جا کر موٹر میں بٹھا دیا۔ میں اور ایم۔اے کا طالب علم موٹر کے آگے لیٹ گئے۔ سب کچھ سمجھایا گیا مگر کسی کی ایک نہ سنی۔ ہم لوگوں کی دیکھا دیکھی اور کئی نوجوان بھی موٹر کے آگے بیٹھ گئے۔اس وقت میرے جوش کا یہ حال تھا کہ منھ سے الفاظ نہ نکلتے تھے صرف روتا تھا اور کہتا تھا ''موٹر میرے اُوپر سے نکال لے جاؤ''۔استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں سے کانگریس کے صدر کو لے جانے والی گاڑی مانگی انھوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ایک نوجوان نے موٹر کا ٹائر کاٹ دیا۔لوک مانیہ نے بہت سمجھایا لیکن وہاں کون سنتا؟ایک کرائے کی گاڑی سے گھوڑے کھول کر لوک مانیہ کے پیروں پر سر رکھ کر انھیں اس میں بٹھایا اور سب نے مل کر ہاتھوں سے گاڑی کھینچنا شروع کیا۔اس طرح لوک مانیہ کا استقبال ہوا کہ کسی لیڈر کی اتنے زور شور سے سواری نہ نکالی گئی۔لوگوں کے جوش و خروش کا یہ حال تھا کہ کہتے تھے کہ ایک بار گاڑی میں ہاتھ لگانے دو زندگی سپھل ہو جائے گی۔لوک مانیہ پر جو پھولوں کی بارش کی جاتی تھی اس میں سے جو پھول نیچے گر جاتے تھے انھیں اُٹھا کر لوگ پلّو میں باندھ لیتے تھے۔جہاں لوک مانیہ کے قدم پڑتے تھے وہاں کی دھول سب کے ماتھے پر دکھائی دیتی۔کچھ اس دھول کو رومال میں باندھ لیتے تھے۔اس استقبال سے ماڈریٹوں کی بڑی توہین ہوئی۔

انقلابی تحریک

کانگریس کے اجلاس کے موقع پر لکھنؤ میں ہی معلوم ہوا کہ ایک خفیہ کمیٹی ہے جس کا خاص مقصد انقلابی تحریک میں حصہ لینا ہے۔ یہیں سے انقلابی تحریک کا ذکر سن کر کچھ عرصے بعد میں بھی انقلابی تحریک کے کاموں میں تعاون کرنے لگا۔اپنے ایک

دوست کے ذریعے انقلابی کمیٹی کا ممبر بن گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں میں ایگزیکٹیو کا ممبر ہو گیا۔ کمیٹی میں روپیہ کی بہت کمی تھی ادھر ہتھیاروں کی بھی ضرورت تھی۔ جب گھر واپس آیا تب خیال آیا کہ ایک کتاب شائع کی جائے اور اس سے جو فائدہ ہو اس سے ہتھیار خریدے جائیں۔ کتاب شائع کرانے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے؟ سوچتے سوچتے مجھے ایک چال سوجھی۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میں کچھ روزگار کرنا چاہتا ہوں جس میں اچھا منافع ہوگا۔ اگر روپئے دے سکیں تو بڑا اچھا ہو۔ انھوں نے 200 روپئے دیئے۔ "امریکہ کو آزادی کیسے ملی۔" نامی کتاب لکھی جا چکی تھی۔ شائع ہونے کا انتظام ہو گیا۔ تھوڑے روپیوں کی اور ضرورت پڑی میں نے والدہ صاحبہ سے دو سو روپئے اور لیے۔ کتاب فروخت ہو جانے پر والدہ صاحبہ کے روپئے پہلے ادا کئے۔ تقریباً دو سو روپئے اور باقی بچے۔ کتابیں ابھی بکنے کے لیے کافی باقی تھیں۔ اسی وقت "دیش واسیوں سے نویدن" (7) نام کا ایک پرچہ چھپوایا گیا کیوں کہ پنڈت گیندا لال جی، برہمچاری جی کی جماعت سمیت گرفتار ہو گئے تھے۔ اب تمام طالب علموں نے زیادہ جوش کے ساتھ کام کرنے کا عہد کیا۔ کئی ضلعوں میں پرچے لگائے گئے اور تقسیم کئے گئے۔ پرچے اور "امریکہ کو آزادی کیسے ملی" دونوں یوپی کی حکومت نے ضبط کر لیے۔

ہتھیاروں کی خرید

زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ دیسی ریاستوں میں ہتھیار (ریوالور، پستول اور رائفل وغیرہ) سب کوئی رکھتا ہے اور بندوق وغیرہ پر کوئی لائسنس نہیں ہوتا۔ اس لیے اس طرح کے ہتھیار آسانی سے مل جاتے ہیں۔ دیسی ریاستوں میں ہتھیاروں پر کوئی لائسنس نہیں یہ بات بالکل درست ہے اور ہر کسی کو بندوق رکھنے کی بھی آزادی ہے۔ لیکن کارتوسی ہتھیار بہت کم لوگوں کے پاس ہوتے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ کارتوس یا ولایتی بارود خریدنے پر پولیس کو اطلاع دینی ہوتی ہے۔ ریاست میں تو کوئی ایسی دکان نہیں ہوتی جس پر کارتوس یا کارتوسی ہتھیار مل سکیں۔ یہاں تک کے ولایتی بارود اور بندوق کی ٹوپی بھی نہیں ملتی کیوں کہ یہ سب چیزیں باہر سے منگانی پڑتی ہیں۔ جتنی چیزیں اس طرح کی باہر سے منگانی پڑتی ہیں۔ ان کے لیے ریزیڈنٹ (گورنمنٹ کا نمائندہ جو ریاستوں میں رہتا ہے) کی اجازت لینی پڑتی ہے۔ بغیر ریزیڈنٹ کی منظوری کے ہتھیار سے متعلق کوئی چیز باہر سے

ریاست میں نہیں جا سکتی۔ اس وجہ سے اس جھنجھٹ سے بچنے کے لیے ریاست ہی میں ٹوپی دار بندوقیں بنتی ہیں اور دیسی بارود بھی وہاں کے لوگ شورا گندھک اور کوئلہ ملا کر اسی سے کام چلاتے ہیں ہتھیار رکھنے کی آزادی ہونے پر بھی گاؤں میں کسی ایک دو مالدار یا زمیندار کے یہاں ٹوپی دار بندوق یا ٹوپی دار چھوٹے پستول ہوتے ہیں جس میں یہ لوگ ریاست میں بنی ہوئی بارود کام میں لاتے ہیں۔ یہ بارود برسات میں سیل کھا جاتی ہے اور کام نہیں دیتی۔ ایک بار میں تنہا ریوالور خریدنے گیا۔ اس وقت میں سمجھتا تھا کہ ہتھیاروں کی دکان ہوگی سیدھے جا کر دام دیں گے اور ریوالور لے کر چلے آئیں گے۔ ہر دکان دیکھی کہیں کسی پر بندوق وغیرہ کا اشتہار یا کوئی دوسرا نشان نہ پایا۔ پھر ایک تانگے پر سوار ہو کر سارے شہر میں گھوما۔ تانگے والے نے پوچھا کیا چاہیے۔

میں نے اُسے ڈرتے ڈرتے اپنا مقصد بتایا۔ اُسی نے دو تین دن گھوم پھر کر ایک ٹوپی دار ریوالور خریدوا دیا اور دیسی بنی ہوئی بارود ایک دکان سے دلوا دی۔ میں کچھ جانتا تو تھا نہیں ایک دم دو سیر بارود خرید ڈالی جو گھر پر صندوق میں رکھے رکھے برسات میں سیل کھا کر پانی ہوگئی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ دوسری بار جب میں انقلابی کمیٹی کا ممبر ہو چکا تھا تب دوسرے ساتھیوں کے مشورے سے دو سو روپے لے کر ہتھیار خریدنے گیا۔ اس بار میں نے بہت کوشش کی تو ایک کباڑی کی سی دوکان پر کچھ تلواریں، خنجر، کٹار وغیرہ اور دو چار ٹوپی دار بندوقیں رکھی دیکھیں۔ میں نے بڑی ہمت کر کے اس سے پوچھا کہ کیا آپ یہ چیزیں فروخت کرتے ہیں اس نے جب ہاں میں جواب دیا تو میں نے دو چار چیزیں دیکھیں۔ دام پوچھے۔ اس طرح بات چیت کر کے پوچھا کہ کیا آپ کارتوسی ہتھیار نہیں فروخت کرتے یا اور کہیں نہیں بکتے۔ تب اس نے تمام تفصیل بتائی۔ اس وقت اس کے پاس ٹوپی دار ایک نالی کے چھوٹے چھوٹے دو پستول تھے۔ میں نے وہ دونوں خرید لئے۔ ایک کٹار بھی خریدی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر آپ پھر آئیں تو کچھ کارتوسی ہتھیار مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔ لالچ بری بلا ہے اس کہاوت کے مطابق اور اس لیے بھی کہ ہم لوگوں کے پاس کوئی دوسرا ایسا ذریعہ بھی نہ تھا جہاں سے ہتھیار مل سکتے ہیں کچھ دنوں کے بعد پھر گیا۔ اس بار اس نے ایک بڑا خوب صورت کارتوسی ریوالور دیا۔ کچھ پرانے کارتوس دیے۔ ریوالور تھا تو پرانا لیکن تھا بہت بڑھیا۔ قیمت اس کی نئے کے برابر دینی پڑی۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ ہتھیاروں کے خریدار ہیں۔ اس نے جی جان سے کوشش کی اور کئی ریوالور اور دو تین رائفلیں مہیا کیں۔ اس کو بھی اچھا

منافع مل جاتا تھا۔ ہر چیز پر وہ بیس بیس روپئے منافع لیتا تھا۔ کسی کسی چیز پر دوگنا نفع کما لیتا تھا۔

اس کے بعد ہماری انجمن کے دو تین ممبر مل کر گئے۔ دکاندار نے بھی ہماری شدید خواہش کے مد نظر ادھر ادھر سے پرانے ہتھیاروں کو خرید کر اُن کی مرمت کی اور نیا جیسا کر کے ہمارے ہاتھ فروخت کرنا شروع کیا۔ خوب ٹھگا۔ ہم لوگ کچھ جانتے نہیں تھے۔ اس طرح تجربہ کرنے سے کچھ نیا پرانا سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے سکلی گر سے ملاقات ہوئی۔ وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ رئیسوں سے ہماری ملاقات کرا دے گا۔ اس نے ایک رئیس سے ملاقات کرائی جس کے پاس ایک ریوالور تھا۔ ہم نے ریوالور خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان حضرت نے اس ریوالور کے ڈیڑھ سو روپئے مانگے۔ ریوالور نیا تھا۔ بہت کہنے سننے پر سو کارتوس انھوں نے دیے اور 155 روپئے لئے۔ 150 روپئے انھوں نے خود لئے اور پانچ روپئے سکلی گر کو کمیشن کے طور پر دیے۔ ریوالور نیا اور چمکتا ہوا تھا سمجھے زیادہ قیمت کا ہو گا خرید لیا۔ پھر سوچا اس طرح ٹھگے جانے سے کام نہ چلے گا۔ کسی طرح کچھ جاننے کی کوشش کی جائے۔ بڑی کوشش کے بعد کلکتہ اور بمبئی سے بندوق فروخت کرنے والوں کی فہرست منگا کر دیکھیں، دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ جتنے ریوالور اور بندوقیں ہم نے خریدی تھیں ایک کو چھوڑ کر سب کے دوگنے دام دئے تھے۔ 155 روپئے کے ریوالور کی قیمت صرف 30 روپئے تھی اور 10 روپئے کے سو کارتوس اس طرح کل ملا کر 40 روپئے کا سودا تھا جس کے بدلے 155 روپئے دینے پڑے۔ بڑا افسوس ہوا۔ لیکن کریں تو کیا کریں اور کوئی دوسرا ذریعہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ عرصے بعد کارخانوں کی فہرست لے کر تین چار ممبر بن کر گئے۔ خوب جانچ پڑتال کی۔ کسی طرح ریاست کی پولیس کو پتہ چل گیا۔ ایک خفیہ پولیس والا مجھے ملا اس نے کئی ہتھیار دلانے کا وعدہ کیا۔ وہ مجھے پولیس انسپکٹر کے گھر لے گیا۔ اتفاقاً پولیس انسپکٹر گھر پر موجود تھے۔ ان کے دروازے پر پولیس کا ایک سپاہی بیٹھا ہوا تھا جسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ محلے میں خفیہ پولیس والے کی آنکھ بچا کر پوچھا کہ فلاں گھر کس کا ہے؟ معلوم ہوا پولیس انسپکٹر کا۔ میں جیسے تیسے نکل آیا اور تیزی سے اپنے رہنے کی جگہ بدل دی۔ اس وقت ہم لوگوں کے پاس دو رائفلیں، چار ریوالور اور دو پستول خریدے ہوئے موجود تھے۔ کسی طرح سے اس خفیہ پولیس والے کو ایک کاریگر سے، جہاں پر ہم اپنے ہتھیاروں کی مرمت کرواتے تھے معلوم ہوا کہ ہم میں سے ایک آدمی اسی دن

جانے والا تھا۔ اس نے چاروں طرف اسٹیشن پر تار دلوائے۔ ریل گاڑیوں کی تلاشی لی گئی۔ لیکن پولیس کی غفلت کی وجہ سے ہم بال بال بچے۔

روپے کی چپت بری ہوتی ہے۔ ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس ایک رائفل تھی۔ معلوم ہوا وہ فروخت کرتے ہیں۔ ہم لوگ پہنچے۔ اپنے آپ کو ریاست کا رہنے والا بتایا۔ انھوں نے اطمینان کرنے کے لیے بہت سے سوالات پوچھے کیوں کہ ہم لڑکے تو تھے ہی۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ پینشن یافتہ مسلمان تھے۔ ہماری باتوں پر انھیں پوری طرح اطمینان نہ ہوا۔ کہا کہ اپنے تھانیدار سے لکھوالاؤ کہ وہ تمھیں جانتا ہے۔ میں گیا جس مقام کا رہنے والا بتایا تھا وہاں کے تھانیدار کا نام معلوم کیا اور ایک دو زمینداروں کے نام معلوم کیے۔ پھر ایک خط لکھا کہ میں اس مقام کے رہنے والے فلاں زمیندار کا بیٹا ہوں اور وہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی خط پر زمینداروں کے ہندی میں اور پولیس کے داروغہ کے انگریزی میں دستخط بنا خط لے جا کر پولیس کپتان کو دیا۔ غور سے دیکھے بغیر وہ بولے "میں تھانے میں دریافت کرلوں"۔ "تمھیں بھی تھانے چل کر اطلاع دینا ہوگی کہ رائفل خرید رہے ہو۔" ہم لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ کے اطمینان کے لیے اتنی مصیبت برداشت کی، دس بارہ روپے خرچ کیے اگر اب بھی یقین نہ آئے تو مجبوری ہے۔ ہم پولیس میں نہیں جائیں گے۔ رائفل کے دام فہرست میں 180 روپے لکھے تھے وہ 250 مانگتے تھے ساتھ میں دو سو کارتوس بھی دے رہے تھے۔ کارتوس بھرنے کا سامان بھی دیتے تھے جو تقریباً 50 روپے کا تھا۔ اس طرح پرانی رائفل کی نئی کے برابر قیمت مانگ رہے تھے۔ ہم لوگ بھی 250 روپے دے رہے تھے۔ پولیس کپتان نے سوچا کہ پورے دام مل رہے ہیں۔ خود بوڑھے ہو چکے تھے کوئی بیٹا بھی نہ تھا۔ اس لیے 250 روپے لے کر رائفل دے دی۔ پولیس میں کچھ پوچھنے نہ گئے۔ انھیں دنوں ریاست میں ایک اعلیٰ عہدے دار کے نوکر سے مل کر اُن کے یہاں سے ریوالور چوری کرایا۔ جس کے دام فہرست میں 75 روپے تھے اُسے 100 روپے میں خریدا۔ ایک ماؤزر پستول بھی چوری کروایا جس کی قیمت فہرست میں اس وقت دو سو روپے تھی۔ ہمیں ماؤزر پستول کے حصول کی بڑی خواہش تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد پستول ہاتھ آیا جس کی قیمت 300 روپے دینی پڑی۔ کارتوس ایک بھی نہ ملا۔ ہمارے پرانے کباڑی دوست کے پاس ماؤزر پستول کے پچاس کارتوس پڑے تھے۔ انھوں نے

بڑا کام دیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی پہلے ماؤزر پستول نہ دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑی سخت محنت کے بعد اس کا استعمال سمجھ میں آیا۔

ہم نے تین رائفلیں، ایک بارہ بور کی دو نالی کارتوسی بندوق، دو ٹوپی دار بندوقیں، تین ٹوپی دار ریوالور اور پانچ کارتوسی ریوالور خریدے۔ ہر ہتھیار کے ساتھ پچاس یا سو کارتوس بھی لے لیے۔ ان سب میں تقریباً چار ہزار روپئے خرچ ہوئے۔ کچھ خنجر اور تلواریں بھی خریدی تھیں۔

مین پوری سازش

ادھر تو ہم لوگ اپنے کام میں مصروف تھے ادھر مین پوری کے ایک ممبر پر لیڈری کا بھوت سوار ہوا۔ انھوں نے اپنی علاحدہ تنظیم بنالی۔ کچھ ہتھیار وغیرہ بھی جمع کیے۔ روپیہ کی کمی پوری کرنے کے لیے ایک ممبر سے کہا کہ اپنے خاندان کے ممبر کے یہاں ڈاکہ ڈلواؤ۔ اس ممبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے حکم نامہ دیا گیا اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی۔ وہ پولیس کے پاس گیا۔ معاملہ کھلا۔ مین پوری میں پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ ہم لوگوں کو بھی اطلاع ملی۔ دہلی میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ سوچا گیا کہ "امریکہ کو آزادی کیسے ملی" نامی کتاب جو یوپی حکومت نے ضبط کرلی تھی کانگریس کے موقع پر فروخت کردی جائے۔ کانگریس کے اجلاس کے موقع پر میں شاہ جہاں پور کی سیوا سمیتی کے ساتھ اپنی ایمبولینس کی ٹولی لے کر گیا تھا۔ ایمبولینس والوں کو ہر مقام پر بغیر روک ٹوک آنے جانے کی اجازت تھی۔ اجلاس کے پنڈال کے باہر آزادی کے ساتھ نوجوان یہ کہہ کر کتاب بیچ رہے تھے۔ یوپی میں ضبط کتاب "امریکہ کو آزادی کیسے ملی" خفیہ پولیس والوں نے کانگریس کا کیمپ گھیر لیا سامنے ہی آریہ سماج کا کیمپ تھا۔ وہاں پر پولیس نے کتب فروشوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ میں نے کانگریس کیمپ پر اپنے رضاکار اس لیے چھوڑ دیے کہ وہ بغیر استقبالیہ کمیٹی کے وزیر یا صدر کی اجازت کے کسی پولیس والے کو کیمپ میں گھسنے نہ دیں۔ میں آریہ سماج کے کیمپ میں گیا۔ سب کتابیں ایک ٹینٹ میں جمع تھیں۔ میں نے اپنے اوور کوٹ میں تمام کتابیں لپیٹ لیں جو تقریباً دو سو ہوں گی اور انھیں کندھے میں ڈال کر پولیس والوں کے سامنے سے نکلا۔ میں وردی پہنے ہوئے تھا کسی نے کوئی شک بھی نہ کیا اور کتابیں بچ گئیں۔

دلی کانگریس سے لوٹ کر شاہ جہاں پور آئے۔ وہاں بھی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ ہم لوگ وہاں سے چل کر دوسرے شہر کے ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کے وقت مکان مالک نے باہر سے تالا لگادیا۔ گیارہ بجے کے قریب ہمارا ایک ساتھی باہر سے آیا۔ اس نے باہر سے تالا پڑا دیکھ کر ہمیں پکارا۔ ہم لوگوں کو بھی شک ہوا۔ سب کے سب دیوار پر سے اتر کر مکان چھوڑ کر چل دئے۔ اندھیری رات تھی۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ پھر آواز آئی۔ "کھڑے ہو جاؤ نہیں تو گولی مارتے ہیں۔" ہم لوگ کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں پولیس کے ایک داروغہ جی بندوق ہماری طرف کئے ہوئے، ریوالور کندھے میں لٹکائے کئی سپاہیوں کے ساتھ آپہنچے۔ پوچھا۔ "کون ہو؟" "کہاں جاتے ہو؟" ہم لوگوں نے کہا۔ "طلباء ہیں اسٹیشن جاتے ہیں۔" "کہاں جاؤ گے؟" اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ لکھنؤ کی گاڑی پانچ بجے جاتی تھی۔ داروغہ صاحب کو کچھ شک ہوا۔ لالٹین آئی ہم لوگوں کے چہرے روشنی میں دیکھ کر ان کا شک جاتا رہا۔ کہنے لگے۔ "رات کے وقت لالٹین لے کر چلا کیجئے۔ غلطی ہوئی معاف کیجئے۔" ہم لوگ بھی سلام جھاڑ کر چلتے بنے۔ ایک باغ میں پھونس کی جھونپڑی پڑی تھی اس میں جا بیٹھے۔ پانی برسنے لگا۔ موسلا دھار پانی گرا۔ تمام کپڑے بھیگ گئے۔ زمین پر بھی پانی بھر گیا۔ خوب جاڑا پڑ رہا تھا۔ رات بھر بھیگتے اور ٹھٹھرتے رہے۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ صبح سویرے دھرم شالا میں جاکر کپڑے سکھائے۔ دوسرے دن شاہ جہاں پور آکر بندوقیں زمین میں گاڑ کر پریاگ پہنچے۔

غداری

پریاگ (الہ آباد) کی ایک دھرم شالا میں دو تین دن رہنے کے بعد سوچا گیا کہ ایک آدمی بہت کمزور ہے اگر وہ پکڑا گیا تو سارا بھید کھول دے گا اس لیے اُسے مار دیا جائے۔ میں نے کہا "انسان کا قتل ٹھیک نہیں۔" لیکن آخر میں طے ہوا کہ کل چلا جائے اور اس کا قتل کر دیا جائے۔ میں خاموش ہو گیا۔ ہم لوگ چار ممبر تھے۔ ہم لوگ سہ پہر میں جھونسی کا قلعہ دیکھنے گئے۔ واپس آئے تو شام ہو چکی تھی۔ اسی وقت گنگا پار کر کے جمنا کے کنارے گئے۔ حوائج ضروری سے فراغت حاصل کی میں شام کی عبادت کرنے ریت پر بیٹھ گیا۔ ایک صاحب نے کہا۔ "جمنا کے قریب بیٹھو۔" میں ساحل سے دور ایک اونچے مقام پر بیٹھا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وہ تینوں بھی میرے قریب ہی آکر بیٹھ گئے۔ میں آنکھیں بند کئے دھیان کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں کھٹ سے آواز ہوئی۔ گولی

سن سے میرے کان کے پاس سے نکل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے اوپر ہی فائر ہوا ہے۔ میں ریوالور نکالتا ہوا آگے بڑھا پیچھے پھر کر دیکھا وہ حضرت ماؤزر ہاتھ میں لئے میرے اوپر گولی چلا رہے ہیں۔ کچھ دن پہلے میرا اُن سے جھگڑا ہو چکا تھا لیکن بعد میں صلح ہو گئی تھی۔ پھر بھی انھوں نے یہ کام کیا۔ میں بھی سامنا کرنے کو تیار ہو گیا۔ تیسرا فائر کر کے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ پریاگ میں دو اور ممبر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ تینوں بھاگ گئے۔ مجھے دیر اس لیے ہوئی کہ میرا ریوالور چمڑے کے خول میں رکھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں بچ کیسے گیا۔ پہلا کارتوس چلا نہیں۔ تین فائر ہوئے۔ میں خوشی سے پرماتما کو یاد کرنے لگا۔ خوشی کے مارے مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی میرے ہاتھ سے ریوالور اور خول دونوں گر گئے۔ اگر اس وقت کوئی قریب ہوتا تو مجھے آرام سے مار سکتا تھا۔ میری یہ حالت تقریباً ایک منٹ تک رہی ہو گی کہ مجھے کسی نے کہا۔ ''اُٹھ'' میں اُٹھا۔ ریوالور اٹھالیا۔ خول اُٹھانا یاد ہی نہ رہا۔ 22 جنوری کا واقعہ ہے۔ میں صرف ایک کوٹ اور تہبند پہنے ہوئے تھا۔ بال بڑھے ہوئے تھے۔ ننگے سر، پیر میں جوتا بھی نہیں تھا ایسے میں کہاں جاؤں؟ مختلف خیالات آرہے تھے۔

انھیں خیالوں میں ڈوبا جمنا کے کنارے بڑی دیر تک گھومتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ دھرم شالا چل کر تالا توڑ سامان نکال لوں۔ پھر سوچا دھرم شالا جانے سے گولی چلے گی فضول میں خون ہوگا۔ ابھی مناسب نہیں۔ تنہا بدلہ لینا مناسب نہیں۔ اور پھر ساتھیوں کو نے کر بدلہ لیا جائے گا۔ میرے ایک دوست پریاگ میں رہتے تھے۔ ان کے پاس جاکر بڑی مشکل سے ایک چادر لی اور ریل سے لکھنؤ آیا۔ لکھنؤ آکر بال بنوائے۔ دھوتی جوتا خریدا کیوں کہ میرے پاس روپے تھے۔ روپے نہ بھی ہوتے تو بھی میں ہمیشہ چالیس پچاس روپے کی سونے کی انگوٹھی پہنے رہتا تھا اُسے کام میں لا سکتا تھا۔ وہاں سے آکر دوسرے ممبروں سے مل کر سب حال سنایا۔ کچھ دن جنگل میں رہا۔ ارادہ کیا کہ سنیاسی بن جاؤں۔ دنیا کچھ نہیں۔ بعد میں پھر والدہ کے پاس گیا۔ انھیں سب کچھ بتایا۔ انھوں نے مجھے گوالیار جانے کا حکم دیا۔ تھوڑے دن کے بعد والد والدہ سب دادی جان کے بھائی کے یہاں آگئے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

میں ہر وقت یہی سوچا کرتا تھا کہ مجھے بدلہ ضرور لینا چاہیے۔ ایک دن عہد کر کے ریوالور لے کر دشمن کے قتل کرنے کے

ارادے سے گیا بھی لیکن کامیابی نہ ملی۔ اسی طرح کی ادھیڑ بن میں مجھے بخار آنے لگا۔ کئی ماہ تک بیمار رہا۔ والدہ میرے خیالات کو سمجھ گئیں۔ انھوں نے مجھے بڑی تسلی دی۔ کہنے لگیں کہ عہد کرو کہ تم اپنے قتل کرنے کی کوشش کرنے والوں کو جان سے نہ مارو گے۔ میں نے عہد کرنے میں آنا کانی کی تو وہ کہنے لگیں کہ میں ماں کے دودھ کے بدلے میں تم سے حلف لیتی ہوں کیا جواب ہے؟ میں نے کہا "میں ان سے بدلہ لینے کا عہد کر چکا ہوں۔ والدہ صاحبہ نے مجھے مجبور کر کے میرا عہد تڑوا دیا۔ اپنی بات پکی رکھی۔ مجھے ہی سر نیچا کرنا پڑا۔ اس دن سے میرا بخار کم ہونے لگا اور میں اچھا ہو گیا۔

فرار کی حالت

میں گاؤں میں دیہاتی لوگوں کی طرح اسی طرح کے کپڑے پہن کر رہنے لگا۔ کھیتی بھی کرنے لگا۔ دیکھنے والے زیادہ سے زیادہ اتنا سمجھ سکتے تھے کہ میں شہر میں رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ پڑھا بھی ہوں۔ کھیتی کے کاموں میں میں نے خصوصی توجہ دی۔ جسم تو تندرست وتوانا تھا ہی تھوڑے ہی دنوں میں اچھا خاصا کسان بن گیا۔ اس سخت زمین میں کھیتی کرنا آسان کام نہیں۔ کیکر نیم کے علاوہ کوئی ایک دو آم کے درخت کہیں بھلے ہی دکھائی دے جائیں۔ باقی یہ بالکل ریگستان ہے۔ کھیت میں جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں جھربیری کے کانٹوں سے پیر بھر جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ کچھ عرصے بعد عادت پڑ گئی۔ جتنا کھیت ایک طاقتور آدمی دن بھر میں جوت سکتا تھا اتنا میں بھی جوت لیتا تھا۔ میرا چہرہ بالکل کالا پڑ گیا۔ تھوڑے دنوں کے لیے میں شاہ جہاں پور گھومنے آیا تو کچھ لوگ مجھے پہچان بھی نہ سکے۔ میں رات کو شاہ جہاں پور پہنچا۔ گاڑی چھوٹ گئی۔ دن کے وقت پیدل جا رہا تھا کہ ایک پولیس والے نے پہچان لیا۔ وہ اور پولیس والوں کو لینے گیا۔ میں بھاگا، پہلے ہی دن کا تھکا ہوا تھا۔ تقریباً 20 میل پہلے دن پیدل چلا تھا۔ اس دن بھی 35 میل پیدل چلنا پڑا۔

میرے والدین نے مدد کی۔ میرا وقت اچھی طرح گزر گیا۔ والدہ کی رقم تو میں نے برباد کر دی۔ والد صاحب سے حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ لڑکے کی گرفتاری وارنٹ کی تکمیل کے لیے لڑکے کا حصہ جو اس کے دادا کی جائیداد میں ہوگا نیلام کیا جائے گا۔ والد صاحب گھبرا کر دو ہزار روپے کا مکان آٹھ سو میں اور دوسری چیزیں بھی تھوڑے داموں میں بیچ کر شاہ جہاں پور

چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دو بہنوں کی شادی ہوئی۔ جو کچھ باقی بچا تھا وہ بھی خرچ ہو گیا۔ والدین کی حالت پھر غریبوں جیسی ہو گئی۔ کمیٹی کے جو دوسرے ممبر بھاگے ہوئے تھے ان کی بہت بری حالت ہوئی۔ مہینوں چنے کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔ دو چار روپے جو دوستوں اور مددگاروں سے ملتے تھے انھیں پر گزر ہوتی تھی۔ پہننے کے لیے کپڑے تک نہ تھے۔ مجبور ہو کر ریوالور اور بندوقیں فروخت کیں تب دن کٹے۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے اور گرفتاری کے خوف سے کوئی انتظام یا نوکری بھی نہ کر سکتے تھے۔

اسی حالت میں مجھے کاروبار کرنے کا خیال آیا۔ میں نے اپنے ہم جماعت اور دوست شری سشیل چندر سین جن کا انتقال ہو چکا تھا کی یاد میں بنگالی زبان کا مطالعہ کیا۔ میرے چھوٹے بھائی کی پیدائش ہوئی تو میں نے اس کا نام سشیل چندر رکھا۔ میں نے سوچا کہ ایک کتابی سیریز نکالو۔ فائدہ بھی ہوگا۔ کام بھی آسان ہے۔ بنگالی سے ہندی میں کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کراؤں گا۔ تجربہ بالکل نہیں تھا۔ بنگالی کتاب ''نبی لست رہسیہ' کا ترجمہ شروع کر دیا۔ جس طرح ترجمہ کیا اس کی یاد کر کے کئی بار ہنسی آجاتی ہے۔ کئی بیل، گائے اور بھینس لے کر اوسر میں چرانے کے لیے چلا جاتا تھا۔ خالی بیٹھا رہنا پڑتا تھا اس لیے کاپی پینسل ساتھ لے جاتا اور کتاب کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ جانور جب کہیں دور نکل جاتے تب ترجمہ چھوڑ لاٹھی لے کر انھیں ہنکانے جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے ایک سادھو کی کٹیا پر جا کر رہا۔ وہاں زیادہ وقت ترجمہ کرنے میں گزارا کرتا تھا۔ کھانے کے لیے آٹا لے جاتا تھا۔ چار پانچ دن کے لیے اکٹھا آٹا رہتا تھا۔ کھانا خود پکا لیتا تھا۔ جب کتاب تیار ہو گئی تو ''سشیل مالا'' کے نام سے سیریز نکالی۔ کتاب کا نام ''بولشیویکوں کی کرتوت'' رکھا۔ دوسری کتاب ''من کی لہر'' چھپوائی۔ اس کاروبار میں تقریباً پانچ سو روپے کا نقصان ہوا۔ جب شاہی اعلان ہوا اور سیاسی قیدی چھوڑے گئے تب شاہ جہاں پور آکر کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ کیا تاکہ والدین کی کچھ خدمت کر سکوں۔ سوچا کرتا تھا کہ اس زندگی میں اب پھر کبھی آزادی سے شاہ جہاں پور نہ جا سکوں گا لیکن خدا کے کرشمے عجیب ہیں۔ وہ دن بھی آئے جب میں دوبارہ شاہ جہاں پور کا باشندہ ہوا۔

پنڈت گیندالال دکشت

آپ کی پیدائش جمنا کے ساحل پر بٹیشور کے قریب مئی گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ نے انگریزی کی دسویں جماعت پاس کی

گیندالال دکشت

تھی۔ آپ جب اوریہ ضلع اٹاوہ میں ڈی اے وی اسکول میں استاد تھے اس وقت آپ نے شیواجی سمیتی قائم کی جس کا مقصد تھا شیواجی کی طرح جماعت بنا کر دولت جمع کرنا اور اس سے ہتھیار خریدنا اور اسے جماعت میں تقسیم کرنا۔ اس کی کامیابی کے لیے آپ ریاست سے ہتھیار لا رہے تھے جو کچھ نوجوانوں کی غفلت کی وجہ سے آگرے کے اسٹیشن کے قریب پکڑ لئے گئے۔ آپ بڑے بہادر اور جوشیلے تھے۔ خاموش بیٹھنا آپ جانتے ہی نہ تھے۔ نوجوانوں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ اُپدیش دیتے رہتے تھے۔ ایک ایک ہفتہ تک بوٹ اور وردی نہ اُتارتے تھے۔ جب آپ برہمچاری جی کے پاس مدد لینے گئے تو بدقسمتی سے گرفتار کر لیے گئے۔ برہمچاری کے گروپ نے انگریزی ریاست میں کئی ڈاکے ڈالے تھے۔ ڈاکے ڈال کر یہ لوگ چنبل کے بیہڑوں میں چھپ جاتے تھے۔ سرکاری ریاست کی طرف سے گوالیار کے مہاراج کو لکھا گیا۔ اس گروپ کو پکڑنے کا انتظام کیا گیا۔ حکومت نے توہندوستانی فوج بھی بھیجی تھی جو آگرہ ضلع میں چنبل کے کنارے بہت دنوں تک پڑی رہی۔ پولیس سوار تعینات کیے پھر بھی یہ لوگ خوف زدہ نہ ہوئے۔ غداری سے پکڑے گئے۔ ان کا ایک آدمی پولیس سے مل گیا۔ ڈاکہ ڈالنے کے لیے بہت دور ایک مقام طے کیا گیا جہاں تک جانے کے لیے ایک پڑاؤ دینا پڑتا تھا۔ چلتے چلتے سب تھک گئے پڑاؤ ڈالا گیا۔ جو آدمی پولیس سے ملا ہوا تھا اس نے کھانا لانے کو کہا کیوں کہ اس کے کسی عزیز کا مکان قریب تھا۔ وہ پوریاں بنوا کر لایا۔ سب پوریاں کھانے لگے۔ برہمچاری جی نے ایک پوری ہی کھائی۔ ان کی زبان جھنجھنے لگی جو زیادہ کھا گئے تھے وہ گر گئے۔ پوری لانے والا پانی لانے کے بہانے چل دیا۔ پوریوں میں زہر ملا ہوا تھا۔ برہمچاری جی نے بندوق اُٹھا کر پوری لانے والے پر گولی چلائی۔ برہمچاری جی کو کئی گولیاں لگیں۔ سارا جسم زخمی

ہو گیا۔ پنڈت گیندالال جی کی آنکھ میں ایک چھرا لگا۔ بائیں آنکھ جاتی رہی۔ کچھ آدمی زہر کی وجہ سے مرے پھر گولی سے مارے گئے۔ اس طرح 80 آدمیوں میں سے 30-25 جان سے مارے گئے۔ سب پکڑ کر گوالیار کے قلعے میں بند کر دیے گئے۔ قلعے میں جب ہم لوگ پنڈت جی سے ملے تب خط بھیج کر انھوں نے ہم کو سب حال بتایا۔ ایک دن قلعہ میں ہم سب لوگوں پر بھی شک ہو گیا تھا بڑی مشکل سے ایک عہدے دار کی مدد سے ہم لوگ نکل پائے۔

جب مین پوری سازش کا مقدمہ چلا پنڈت گیندالال جی کو سرکار نے گوالیار ریاست سے بلوایا۔ گوالیار کے قلعے کی آب و ہوا بڑی ہی نقصان دہ تھی۔ پنڈت جی کو ٹی بی کی بیماری ہو گئی۔ مین پوری اسٹیشن سے جیل جاتے ہوئے گیارہ بار راستے میں دم لے کر جیل پہنچے۔ پولیس نے جب حال پوچھا تو انھوں نے کہا۔ "بچوں کو کیوں گرفتار کیا ہے؟" میں حال بتاؤں گا۔ پولیس کو یقین آ گیا۔ م آپ کو جیل سے نکال کر دوسرے سرکاری گواہوں کے قریب رکھا گیا۔ وہاں پر سب تفصیل جان کر رات کے وقت ایک اور سرکاری گواہ کو لے کر پنڈت جی فرار ہو گئے۔ فرار ہو کر گاؤں میں ایک کوٹھری میں ٹھہرے۔ ساتھی کسی کام کے لیے بازار گیا تھا۔ پنڈت جی اسی کوٹھری میں بغیر کھائے پیئے تین دن تک بند رہے۔ سمجھے کہ ساتھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو گا آخر کار کسی طرح دروازہ کھلوایا۔ روپے وہ سب ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ایک پیسہ بھی پاس نہ تھا۔ کوٹہ سے پیدل آ کر رہے آئے۔ کسی طرح اپنے گھر پہنچے۔ بہت بیمار تھے۔ والد نے یہ سمجھ کر کہ گھر والوں پر مصیبت نہ آئے پولیس کو اطلاع دینی چاہی۔ پنڈت جی نے والد کی بڑی منت سماجت کی اور دو تین دن میں گھر چھوڑ دیا۔ ہم لوگوں کی بہت تلاش کی۔ کسی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ دلی میں ایک پیاؤ پر پانی پلانے کی نوکری کر لی۔ حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ مرض تشویش ناک شکل اختیار کر رہا تھا۔ چھوٹے بھائی اور بیوی کو بلوایا۔ بھائی بالکل لاچار اور بے بس وہ کیا کر سکتا تھا۔ سرکاری اسپتال میں داخل کرانے لے گیا۔ پنڈت جی کی بیوی کو دوسرے مقام پر بھیج کر جب وہ اسپتال آیا تو جو کچھ دیکھا اُسے لکھتے ہوئے قلم کانپنے لگتا ہے۔ پنڈت جی انتقال فرما چکے تھے۔ صرف ان کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ مادر وطن کی آزادی میں پنڈت گیندالال جی دکشت نے جس بے چارگی کی حالت میں آخری قربانی دی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ پنڈت جی کی شدید خواہش تھی کہ اُن کا انتقال گولی لگ کر ہو ہندوستان کی ایک عظیم روح رخصت ہو گئی اور ملک میں

کسی کو معلوم بھی نہ ہوا۔ آپ کی وسیع سوانح حیات ماہنامہ ”پربھا“ میں شائع ہو چکی ہے۔ مین پوری سازش کے خاص لیڈر آپ ہی سمجھے گئے۔ اس سازش میں خاص بات یہ ہوئی کہ لیڈروں میں سے صرف دو آدمی پولیس کے ہاتھ آئے جن میں گیندا لال دکشت ایک سرکاری گواہ کو لے کر بھاگ گئے اور دوسرے شیو کرشن جیل سے بھاگ گئے پھر ہاتھ نہ آئے۔ چھ ماہ کے بعد جنھیں سزا ہوئی وہ بھی شاہی اعلان سے آزاد کر دیے گئے محکمہ خفیہ پولیس کا غصہ پوری طرح سرد نہ ہو پایا اور ان کی بدنامی بھی اس کیس میں بہت ہوئی۔

باب سوم

آزاد زندگی

شاہی اعلان کے بعد جب میں شاہ جہاں پور آیا تو شہر کی عجیب حالت دیکھی۔ کوئی پاس تک کھڑے ہونے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ جس کے پاس میں جا کر کھڑا ہو جاتا تھا وہ سلام کر کے چلا جاتا تھا۔ پولیس کا بڑا عتاب تھا۔ ہر وقت وہ سائے کی طرح پیچھے پیچھے پھرا کرتی۔ اس طرح کی زندگی کب تک گزاری جائے؟ میں نے کپڑا بننے کا کام سیکھنا شروع کیا۔ جولاہے بڑا دکھ دیتے تھے۔ کوئی کام سکھانا نہ چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے کچھ کام سیکھا۔ اسی وقت ایک کارخانے میں منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے اس جگہ کے لیے کوشش کی۔ مجھ سے پانچ سو روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ میری حالت تشویش ناک تھی۔ تین تین دن کھانا نہیں ملتا تھا کیونکہ میں نے عہد کیا تھا کہ کسی سے کچھ مدد نہیں نہ لوں گا۔ والد صاحب سے بغیر کہے سنے میں چلا آیا۔ میں پانچ سو روپے کہاں سے لاتا؟ میں نے دو ایک دوستوں سے صرف دو سو روپیہ کی ضمانت کی درخواست کی۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ میرے دل پر بجلی گر پڑی۔ دنیا اندھیری نظر آنے لگی۔ لیکن بعد میں ایک دوست کی مہربانی سے نوکری مل گئی۔ اب حالات کچھ سدھر گئے۔ میں بھی مہذب افراد کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ میرے پاس بھی چار پیسے ہو گئے۔ وہی دوست جن سے میں نے دو سو روپے کی ضمانت کی درخواست کی تھی میرے پاس چار چار ہزار کی تھیلی اپنی بندوق کا لائسنس وغیرہ سب ڈال جاتے تھے کہ یہاں ان کی اشیا محفوظ رہیں گی۔ وقت کے اس پھیر کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ جاتی تھی۔

اس طرح کچھ وقت گزرا۔ دو چار آدمیوں سے ملاقات ہوئی جن کو میں پہلے بڑی عقیدت سے دیکھا کرتا تھا۔ ان لوگوں کو میری فراری کے بارے میں کچھ اطلاعات ملی تھیں۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ میری لکھی ہوئی کتابیں بھی

دیکھیں۔ اس وقت تک میں تیسری کتاب "کیتھیر ائن" لکھ چکا تھا۔ مجھے کتابوں کے کاروبار میں بہت نقصان ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بڑی اشاعت ملتوی کردی۔ کیتھیر ائن ایک کتابوں کے پبلشر کو دے دی۔ انھوں نے بڑی عنایت کر کے کچھ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ شائع کردی۔ کیتھیر ائن کو دیکھ کر میرے قریبی دوستوں کو بڑی مسرت ہوئی۔ انھوں نے مجھے کتابیں لکھتے رہنے کی ترغیب و تحریص دلائی۔ میں نے "سودیشی رنگ" نام کی کتاب لکھ کر ایک دوسرے پبلشر کو دی وہ بھی بڑی محنت کے بعد شائع ہوئی۔

بڑی محنت کے بعد میں نے ایک کتاب "کرانتی کاری جیون" لکھی۔ "کرانتی کاری جیون" کو کئی کتابوں کے پبلشروں نے دیکھا لیکن کسی کی ہمت نہ ہو پائی کہ اُسے شائع کرے۔ آگرہ، کانپور، کلکتہ وغیرہ کئی مقامات پر گھوم کر کتاب میرے پاس واپس آگئی۔ کئی ماہانہ رسائل میں رام اور نامعلوم کے نام سے میرے مضامین شائع ہوا کرتے تھے لوگ بڑی دلچسپی سے اُن مضامین کو پڑھا کرتے تھے۔ میں نے کسی مقام پر لکھنے کے فن کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے خالی اوقات ہی میں کچھ لکھا کرتا اور شائع ہونے کے لیے بھیج دیا کرتا۔ زیادہ تر تو انگریزی اور بنگالی زبان سے ترجمہ کرنے کا ہی خیال تھا۔ کچھ وقت کے بعد شری اروند گھوش کی بنگالی کتاب "یوگک سادھن" کا ترجمہ کیا۔ دو ایک کتابوں کے پبلشروں کو دکھایا لیکن وہ بہت کم قیمت دے کر کتاب لینا چاہتے تھے۔ آج کل کے زمانے میں ہندی کے مصنفوں اور مترجموں کی کثرت کی وجہ سے کتابوں کے پبلشروں کے بھی بڑے نخرے ہوگئے ہیں۔ بڑی مشکل سے بنارس کے ایک پبلشر نے یوگک سادھن شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں وہ اپنی دکان بند کر کے کہیں چلے گئے۔ کتاب کا اب تک کوئی پتہ نہ چلا۔ کتاب بہت اچھی تھی۔ کتاب شائع ہو جانے سے ہندی ادب کے شائقین کو کافی فائدہ ہوتا۔ میرے پاس "بولشیویکوں کی کرتوت" اور "من کی لہر" کی جو کاپیاں باقی تھیں وہ میں نے لاگت سے بھی کم قیمت پر کلکتہ کے ایک صاحب جناب دیناناتھ سکلتیہ کو دے دیں۔ بہت تھوڑی سی کتابیں میں نے فروخت کی تھیں۔ حضرت دیناناتھ کتابیں ہڑپ کر گئے۔ میں نے نوٹس دیا۔ نالش کی۔ تقریباً چار سو روپے کی ڈگری بھی ہوئی لیکن اُن حضرت دیناناتھ کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ کلکتہ چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے۔ پٹنہ میں بھی کئی غریبوں کا روپیہ مار کر کہیں چھپ گئے۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس طرح ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ کوئی رہنما یا معاون نہ تھا جس سے مشورہ کرتا۔ فضول کے کام دھندوں اور

آزادانہ کاموں میں اپنی طاقت ضائع کرتا رہا۔

از سر نو تنظیم

جن عظیم لوگوں کو میں احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا انھوں نے ہی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں انقلابی جماعت کی دوبارہ تنظیم کروں پچھلی زندگی کے تلخ تجربات سے میرا دل بہت رنجیدہ تھا۔ میرا حوصلہ نہ دیکھ کر ان لوگوں نے بڑی ہمت افزائی کی اور کہا کہ ہم آپ کو صرف نگرانی کا کام سونپیں گے باقی سارا کام خود کریں گے۔ کچھ آدمی ہم نے پہلے ہی مہیا کر لئے ہیں۔ روپیہ کی کوئی کمی نہ ہوگی وغیرہ۔ معزز افراد کی دلچسپی دیکھ کر میں نے بھی منظوری دے دی۔ میرے پاس جو ہتھیار تھے میں نے دیے۔ جو جماعت انھوں نے بنائی تھی اس کے لیڈر سے مجھے ملوایا۔ اس کی بہادری کی بڑی تعریف کی۔ وہ ایک جاہل دیہاتی تھا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ یہ بدمعاشوں یا خود غرض لوگوں کی کوئی تنظیم ہے۔

مجھ سے اس جماعت کے لیڈر نے جماعت کے کام کے معائنہ کرنے کی درخواست کی جماعت میں کئی فوج اور لڑائی سے واپس کئے گئے افراد تھے۔ مجھے اس طرح کے افراد سے کبھی کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔ میں چند افراد کو لے کر ان لوگوں کا کام دیکھنے کے لیے گیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد اس جماعت کے لیڈر ایک طوائف کو بھی لے آئے۔ اُسے ریوالور دکھایا کہ اگر کہیں گئی تو گولی سے ماردی جائے گی۔ یہ خبر سن کر اُسی جماعت کے دوسرے ممبر بہت ناراض ہوئے اور میرے پاس خبر بھیجنے کا انتظام کیا۔ اسی وقت ایک دوسرا آدمی پکڑا گیا جو لیڈر سے واقف تھا۔ حضرت لیڈر ریوالور اور سونے کے زیورات کے ساتھ گرفتار ہو گئے اُن کی بہادری کی بڑی تعریف سنی تھی جو اس طرح ظاہر ہوئی کہ کئی آدمیوں کے نام پولیس کو بتا دیے اور اقبال جرم کر لیا۔ تقریباً تیس چالیس آدمی پکڑے گئے۔

ایک دوسرا شخص جو بہت بہادر تھا اور پولیس اس کے پیچھے پڑی تھی ایک دن پولیس کپتان نے سوار اور تیس چالیس بندوق والے لے کر اس کے گھر میں اُسے گھیر لیا۔ اس نے چھت پر چڑھ کر دونالی بندوق سے تقریباً 300 فائر کئے بندوق گرم ہو کر

نکل گئی۔ پولیس والے سمجھے کہ گھر میں کئی آدمی ہیں۔ سب پولیس والے چھپ کے آڑ میں سے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ اس نے موقع پایا۔ مکان کے پیچھے سے کود پڑا ایک سپاہی نے اُسے دیکھ لیا۔ اس نے سپاہی کی ناک پر ریوالور کا کندہ مارا۔ سپاہی چلایا۔ سپاہی کو دھوکا ہوا ہوگا۔ بس وہ جنگل میں نکل گیا۔ جنگل میں جاکر ایک دوسرے گروپ سے ملا۔ جنگل میں بھی ایک بار پولیس کپتان سے سامنا ہو گیا۔ گولی چلی۔ اس کے پیر میں بھی چھرّے لگے تھے۔ اب یہ بڑے بہادر ہو گئے تھے۔ سمجھ گئے تھے کہ پولیس والے کس طرح وقت پر آڑ میں چھپ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا گروپ تتر بتر ہو گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے میرے پاس پناہ لینی چاہی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اس کے بعد جنگل میں جاکر یہ دوسرے گروپ سے مل گئے۔ وہاں پر بد چلنی کی وجہ سے جنگل کے گروپ کے سرغنہ نے انھیں گولی مار دی۔ اس سرغنہ کو بھی موقع پاکر اس کے ساتھی نے گولی مار دی۔ اس طرح پورا گروپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جو پکڑے گئے ان پر کئی ڈکیتی کے مقدمے چلے کسی کو تیس سال کسی کو پچاس سال کسی کو بیس سال کی سزائیں ہوئیں۔ ایک بے چارہ جس کا کسی ڈکیتی سے کوئی تعلق نہ تھا صرف دشمنی کی وجہ سے پھنسا دیا گیا۔ اُسے پھانسی ہو گئی اور جو ہر طرح ڈکیتیوں میں شامل تھا جس کے پاس ڈکیتی کا مال اور کچھ ہتھیار پائے گئے تھے پولیس سے گولی بھی چلی تھی اُسے پہلے پھانسی کی سزا کا حکم ہوا لیکن پیروی اچھی ہوئی اس لیے ہائی کورٹ سے پھانسی کی سزا معاف ہو گئی صرف پانچ سال کی سزا رہ گئی۔ جیل والوں سے مل کر اس نے ڈکیتیوں میں شناخت نہ ہونے دی اس طرح اس گروپ کا خاتمہ ہوا۔ خدا کے فضل سے ہمارے ہتھیار بچ گئے۔ صرف ایک ہی ریوالور پکڑا گیا۔

نوٹ بنانا

اسی دوران میرے ایک دوست کی ایک نوٹ بنانے والے حضرت سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے۔ بڑی لمبی چوڑی اسکیمیں باندھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ایک نوٹ بنانے والے سے ملاقات ہوئی ہے۔ بڑا ماہر انسان ہے۔ مجھے بھی بنا ہوا نوٹ دیکھنے کی بڑی شدید خواہش تھی میں نے اُن حضرت کے دیدار کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ نوٹ بنانے والے حضرت مجھ سے ملے تو بڑی بڑی باتیں کیں۔ میں نے کہا کہ میں جگہ اور مالی امداد دوں گا نوٹ بناؤ۔ جس طرح انھوں نے کہا

میں نے انتظام کر دیا لیکن میں نے کہہ دیا تھا کہ نوٹ بناتے وقت میں وہاں موجود رہوں گا۔ مجھے کچھ مت بتانا لیکن میں نوٹ بنانے کا طریقہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ پہلے پہل انھوں نے دس روپے کا نوٹ بنانے کا ارادہ کیا۔ مجھ سے ایک دس روپے کا نیا اور صاف نوٹ مانگا۔ نو روپے دوا خریدنے کے بہانے سے لے گئے۔ رات میں نوٹ بنانے کا انتظام ہوا۔ دوائیوں کو ملا کر ایک پلیٹ میں سادے کاغذ پانی میں بھگوئے۔ میں جو صاف نوٹ لایا تھا اس پر ایک سادہ کاغذ لگا کر دونوں کو دوسری دوا ڈال کر دھویا۔ پھر دو سادے کاغذوں میں لپیٹ کر پڑیا سی بنائی اور اپنے ایک ساتھی کو دی کہ اُسے آگ پر گرم کرا لائے۔ آگ وہاں سے کچھ فاصلے سے جل رہی تھی۔ کچھ دیر وہ آگ پر گرم کرتا رہا اور پڑیا لا کر واپس دے دی۔ نوٹ بنانے والے نے پڑیا کھول کر دونوں شیشوں میں دبا کر شیشوں کو دوا سے دھویا اور فیتے سے شیشوں کو باندھ کر رکھ دیا اور کہا کہ دو گھنٹے میں نوٹ بن جائے گا۔ شیشے رکھ دیے۔ بات چیت ہونے لگی۔ کہنے لگا "اس تجربے میں بہت خرچ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نوٹ بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بڑے نوٹ بنانے چاہییے جس سے کافی دولت حاصل ہو۔" اس طرح مجھے بھی سکھا دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے کچھ کام تھا۔ میں جانے لگا تو وہ بھی چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد آنے کا طے ہوا۔

میں سوچنے لگا کہ کس طرح ایک نوٹ کے اوپر دوسرا سادہ کاغذ رکھنے سے نوٹ بن جائے گا۔ میں نے پریس سے کام سیکھا تھا۔ تھوڑی بہت فوٹو گرافی بھی جانتا تھا۔ سائنس کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ نوٹ سیدھا کیسے چھپے گا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نمبر کیسے چھپیں گے۔ مجھے بہت شک ہوا۔ دو گھنٹہ بعد جب میں گیا تو ریوالور بھر کر جیب میں ڈال کر لے گیا۔ وقت کے مطابق وہ حضرت تشریف لائے۔ انھوں نے شیشے کھول کر کاغذ نکال کر انھیں پھر ایک دوا سے دھویا۔ اب دونوں کاغذ کھولے۔ ایک میرا لایا ہوا نوٹ اور دوسرا ایک دس روپے کا نوٹ اس کے اوپر سے اُتار کر دکھایا کہا۔ "کتنا صاف نوٹ ہے" میں نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ دونوں نوٹوں کے نمبر ملائے۔ نمبر قطعی مختلف تھے۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کر نوٹ بنانے والے حضرت کے سینے پر رکھ دیا۔ کہا "بدمعاش! اس طرح ٹھگتا پھرتا ہے؟" وہ کانپ کر گر پڑا۔ میں نے اس کی بے وقوفی سمجھائی کہ یہ ڈھونگ گاؤں والوں کے سامنے چل سکتا ہے انجان پڑھے لکھے بھی دھوکے میں آ سکتے ہیں۔ لیکن تو مجھے دھوکہ دینے آیا

ہے۔ آخر میں میں نے اس سے حلف نامہ لکھوا کر اس پر اس کے ہاتھوں کی دسوں انگلیوں کے نشان لگوائے۔ کہ وہ ایسا کام پھر نہیں کرے گا۔ دسوں انگلیوں کے نشان دینے میں اس نے کچھ ڈھیل کی۔ میں نے ریوالور اُٹھا کر کہا کہ گولی چلتی ہے اس نے فوراً دسوں انگلیوں کے نشان بنا دیے۔ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میرے اُنیس روپے خرچ ہو چکے تھے۔ میں نے دونوں نوٹ رکھ لیے اور شیشے دوائیں وغیرہ سب چھین لیں کہ دوستوں کو تماشا دکھاؤں گا۔ اس کے بعد ان حضرت کو رخصت کیا۔ اس نے کیا یہ تھا کہ جب اپنے ساتھی کو آگ پر گرم کرنے کے لیے کاغذ کی پڑیا دی تھی اُسی وقت وہ ساتھی سادے کاغذ کی پڑیا بدل کر دوسری پڑیا لے آیا جس میں دونوں نوٹ تھے۔ اس طرح نوٹ بن گیا۔

اس طرح کا ایک بڑا بھاری گروپ ہے جو تمام ہندوستان میں ٹھگی کا کام کر کے ہزاروں روپیہ پیدا کرتا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جنھوں نے اسی طرح پچاس ہزار سے زیادہ روپے پیدا کئے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ایجنٹ رکھتے ہیں۔ یہ ایجنٹ عام لوگوں کے پاس جائز نوٹ بنانے کی کہانی سناتے ہیں۔ آتی دولت کسے بری لگتی ہے؟ وہ نوٹ بنواتے ہیں۔ اس طرح پہلے دس کا نوٹ بنا کر دیا۔ وہ بازار میں بیچ آئے۔ سو روپے کا بنا کر دیا وہ بھی بازار میں چلایا اور چل کیوں نہ جائے؟ اس طرح کے سب نوٹ اصلی ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف چال سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ ہزار یا پانچ سو کا نوٹ لاؤ تو کچھ دولت بھی ملے۔ جیسے تیسے کر کے بے چارا ایک ہزار کا نوٹ لایا۔ سادہ کاغذ رکھ کر شیشے میں باندھ دیا۔ ہزار کا نوٹ جیب میں رکھا اور چمپت ہوئے۔ نوٹ کے مالک راستہ دیکھتے ہیں۔ وہاں نوٹ بنانے والوں کا پتہ ہی نہیں۔ آخر میں مجبور ہو کر شیشے کو کھولا جاتا ہے تو وہ سادے کاغذوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ جاتے ہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر پولیس کو معلوم ہو گیا تو اور لینے کے دینے پڑیں گے کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ کلیجہ مسوس کے رہ جاتے ہیں۔ پولیس نے اس طرح کے کچھ مجرموں کو گرفتار بھی کیا لیکن یہ لوگ پولیس کو باقاعدگی سے چوتھ (رشوت) دیتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے بچے رہتے ہیں۔

چالبازی

کئی حضرات نے خفیہ کمیٹی کے اصول و ضوابط مجھے بتا کر دکھائے ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ جو اشخاص کمیٹی کا کام کریں

انھیں کمیٹی کی طرف سے کچھ ماہانہ دیا جائے۔ میں نے اس اصول کو قطعی نامنظور کر دیا۔ میں یہاں تک متفق تھا کہ جو شخص کمیٹی میں اپنا پورا وقت صرف کرے اس کو صرف گزارے لائق روپیہ کمیٹی کی طرف سے دیا جائے۔ جو لوگ کوئی انتظام کرتے ہیں انھیں کسی طرح کا بھتہ دینا مناسب نہ ہوگا۔ جنھیں کمیٹی کے فنڈ سے کچھ دیا جائے انھیں بھی کچھ کاروبار کرنا مناسب ہے تاکہ وہ لوگ مکمل طور پر کمیٹی کی امداد پر انحصار کر کے محض کرایہ کے ٹٹو نہ بن جائیں۔ کرایہ کے ٹٹوؤں سے کمیٹی کا کام لینا جس میں بہت سے افراد کی جان کی ذمہ داری ہو اور ذرا سا بھید کھلنے پر بڑے خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں، مناسب نہیں ہے۔ اس کے بعد اُن حضرت کی رائے ہوئی کہ ایک مقررہ فنڈ کمیٹی کے ممبروں کو دینے کے لیے قائم کیا جائے جس کی آمدنی کی تفصیل اس طرح ہو کہ ڈکیتیوں سے جتنا روپیہ حاصل ہو اس کا آدھا کمیٹی کے کاموں میں خرچ کیا جائے اور آدھا کمیٹی کے ممبروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح کے مشوروں سے میں متفق نہ ہو سکا اور میں نے اس طرح کی خفیہ کمیٹی میں جس کا ایک مقصد پیٹ بھرنا ہو تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ جب میرا اس طرح کا رویہ دیکھا تو ان حضرات نے آپس میں سازش کی۔

جب میں نے ان حضرات کے مشوروں اور ان کے اصولوں کو تسلیم نہ کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ میں بھی کچھ سمجھ نہ سکا کہ جو لوگ مجھ سے اتنی عقیدت رکھتے تھے جنھوں نے کئی طرح کی اُمیدیں وابستہ کر کے مجھ سے انقلابی جماعت کی از سرِ نو تنظیم کرنے کی درخواست کی تھی مختلف طرح کی اُمیدیں وابستہ کی تھیں تمام کام خود کرنے کے وعدے کیے تھے وہ لوگ ہی مجھ سے اس طرح کے اصول بنانے کی مانگ کرنے لگے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پہلی بار میں جس وقت میں پوری سازش کے ممبروں سمیت کام کرتا تھا اس وقت ہم میں سے کوئی بھی اپنے نجی خرچ میں کمیٹی کا روپیہ خرچ کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ جہاں تک ہو سکتا اپنے خرچ کے لیے والدین سے کچھ لاکر ہر ممبر کمیٹی کے کاموں میں روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے میری ہمت اس طرح کے اصولوں سے متفق ہونے کی نہ ہو سکی۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی ایسا وقت آیا اور کسی طرح زیادہ روپیہ جمع ہو گیا تو کچھ ممبر ایسے خود غرض ہو سکتے ہیں جو زیادہ روپیہ لینے کی خواہش کریں اور آپس میں دشمنی بڑھے۔ اس کے نتائج بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کے کاموں میں تعاون دینا میں نے مناسب نہ سمجھا۔

میری یہ حالت دیکھ کر ان لوگوں نے آپس میں سازش کی کہ جس طرح میں کہوں وہ اصول تسلیم کر لیں اور یقین دلا کر جتنے ہتھیار میرے پاس ہیں ان کو مجھ سے لے کر سب پر اپنا قبضہ جما لیں۔ اگر ہتھیار مانگوں تو مجھ سے لڑائی کی جائے اور ضرورت پڑے تو مجھے کہیں لے جا کر مار دیا جائے۔ تین افراد نے اس طرح کی سازش کی اور مجھ سے چالبازی کرنی چاہی۔ خدا کے فضل سے ان میں سے کسی ایک کے دل میں رحم آ گیا۔ اس نے آ کر مجھے ساری بات بتا دی۔ مجھے سن کر بڑا افسوس ہوا کہ جن لوگوں کو میں باپ جیسا سمجھ کر احترام کرتا ہوں وہ ہی مجھے ختم کرنے کے لیے اس طرح کا ذلالت کا کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں سنبھل گیا۔ میں ان لوگوں سے ہوشیار رہنے لگا کہ دوبارہ پریاگ جیسا حادثہ نہ ہو۔ جن صاحب نے مجھے سازش کے بارے میں بتایا تھا ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک ریوالور رکھیں اور اسی خواہش کی تکمیل کے لیے انھوں نے میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بھید بتایا تھا۔ مجھ سے ایک ریوالور مانگا کہ میں انھیں کچھ عرصے کے لیے ایک ریوالور دے دوں۔ اگر میں انھیں ریوالور دے دیتا تو اسے وہ ہضم کر جاتے۔ میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ اور اب ریوالور حاصل کرنا کوئی آسان کام بھی نہ تھا۔ بعد میں بڑی دشواری سے ان چالبازوں سے اپنا پیچھا چھڑایا۔

اب ہر طرف سے ذہن کو ہٹا کر بڑی لگن سے نوکری میں وقت گزارنے لگا۔ کچھ روپیہ جمع کرنے کے خیال سے کچھ کمیشن وغیرہ کا انتظام کر لیتا تھا۔ اس طرح والد صاحب کا تھوڑا ہاتھ بٹایا۔ سب سے چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ والد صاحب کی طاقت سے باہر تھا کہ اس کی شادی کسی اچھے گھر میں کر سکتے۔ میں نے روپیہ جمع کر کے بہن کی شادی ایک اچھے زمیندار کے یہاں کر دی۔ والد صاحب کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اب صرف والدہ، والد اور چھوٹے بھائی تھے جن کے کھانے کا انتظام کرنا مشکل نہ تھا۔ اب والدہ کی شدید خواہش ہوئی کہ میں بھی شادی کر لوں۔ کئی اچھے اچھے شادی کے رشتے بتائے گئے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ جب تک کافی روپیہ جمع نہ ہو جائے ازدواجی رشتے میں بندھنا مناسب نہیں۔ میں نے نوکری چھوڑ کر آزادانہ کاروبار کیا۔ ایک دوست نے میری مدد کی۔ میں نے ریشمی کپڑے بنانے کا ایک نجی کارخانہ کھول لیا۔ بڑی لگن اور محنت سے کام کیا۔ خدا کی مہربانی سے بڑی کامیابی ملی۔ ایک ڈیڑھ سال میں ہی میرا کارخانہ چمک گیا۔ تین چار ہزار سے کام شروع کیا تھا۔ ایک سال بعد سب خرچ

نکال کر تقریباً دو ہزار کا نفع ہوا۔ میرا جوش اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے ایک دو کام اور بھی شروع کر دیے۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ یوپی کی انقلابی جماعت کی از سر نو تنظیم ہو رہی ہے۔ کام شروع ہو چکا ہے۔

میں نے تعاون کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس وقت میں اپنے کاروبار میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ میں نے چھ ماہ کی مہلت لی کہ چھ ماہ میں اپنا کاروبار اپنے پارٹنر کو سونپ دوں گا اور خود کو اس میں سے نکال لوں گا اور تب آزادی کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں تعاون کر سکوں گا۔ چھ ماہ تک میں نے اپنے کارخانے کا سب کام صاف کر کے اپنے ساتھی کو سب کام سمجھا دیا اس کے بعد حسب وعدہ کام میں مدد دینے کی کوشش کی۔

باب چہارم

وسیع تنظیم

اگرچہ میں اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں کوئی حصہ نہ لوں گا اس کے باوجود مجھے دوبارہ انقلابی تحریک میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میری خواہش ختم نہیں ہوئی تھی میرے دل کے ارمان نہ نکلے تھے تحریک عدم تعاون دم توڑ چکی تھی۔ پوری امید تھی کہ ملک کے جتنے نوجوان اس تحریک سے وابستہ تھے ان میں سے زیادہ تر نوجوان انقلابی تحریک میں تعاون کریں گے اور پوری لگن سے کام کریں گے۔ جب کام شروع ہوا اور عدم تعاون تحریک کے لوگوں کو ٹٹولا گیا تو وہ تحریک سے کہیں زیادہ پژمردہ تھے۔ ان کی امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ ذاتی پونجی ختم ہو چکی تھی۔ گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔ آگے کی بھی کوئی امید نہ تھی کانگریس میں بھی سوراجیہ پارٹی کا زور ہو گیا تھا۔ جس کے پاس کچھ روپیہ اور قریبی دوستوں کی تنظیم تھی وہ کونسلوں اور اسمبلیوں کے ممبر بن گئے۔ ایسی حالت میں اگر انقلابی تنظیم کاروں کے پاس کافی سرمایہ ہوتا تو وہ عدم تعاون تحریک سے وابستہ نوجوانوں کو ہاتھ میں لے کر ان سے کام لے سکتے تھے۔ کتنا بھی خلوص سے کام کرنے والے ہوں لیکن پیٹ تو سب کے پاس ہے۔ دن بھر میں تھوڑی خوراک ملنی ضروری ہے۔ پھر جسم ڈھانپنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کچھ ایسا انتظام ہونا چاہیے جس سے روزمرہ کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ جتنے مالدار قسم کے محب وطن تھے انھوں نے عدم تعاون تحریک میں پورا تعاون کیا تھا۔ پھر بھی کچھ ایسے رحم دل حضرات تھے جو تھوڑی بہت مالی امداد دیتے تھے۔ لیکن تمام صوبے کے ہر ضلع میں تنظیم قائم کرنے کا خیال تھا۔ پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے بھی پوری کوشش کرنی پڑتی تھی۔ ایسے حالات میں عام اصولوں کو عمل میں لاتے ہوئے کام کرنا بڑا دشوار تھا۔ کافی کوششوں کے بعد کچھ بھی کامیابی نہ ملتی تھی۔ دو چار ضلعوں میں منتظم

مقرر کیے گئے تھے جن کو کچھ ماہانہ گزارہ دیا جاتا تھا۔ پانچ دس ماہ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ بعد میں جو مددگار کچھ امداد دیتے تھے انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب ہم لوگوں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ کام کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تھی۔ کوئی بھی کسی طرح کی مدد نہ دیتا تھا۔ ادھر ادھر الگ الگ ضلعوں میں کام کرنے والے ماہانہ خرچ کی مانگ کر رہے تھے۔ کئی میرے پاس بھی آئے۔ میں نے کچھ روپیہ قرض لے کر اُن لوگوں کو ایک ماہ کا خرچ دیا۔ کئی لوگوں پر کچھ قرض بھی ہو چکا تھا۔ میں قرض ادا نہ کر سکا۔ ایک مرکز کے کارکنوں کو جب حسب ضرورت کافی روپیہ نہ مل سکا تو وہ کام چھوڑ کر چلے گئے۔ میرے پاس کیا انتظام تھا جو میں اُن کا پیٹ بھر سکتا؟ عجیب مسئلہ تھا۔ کسی طرح ان لوگوں کو سمجھایا۔

تھوڑے دنوں میں انقلابی پرچے آ گئے۔ تمام ملک میں مقررہ تاریخ پر تقسیم کیے گئے۔ رنگون، بمبئی، لاہور، امرت سر، کلکتہ اور بنگال کے خاص شہروں اور یوپی کے تمام خاص خاص ضلعوں میں کافی تعداد میں پرچوں کی تقسیم ہوئی۔

حکومت ہند بڑی پریشان ہوئی کہ ایسی کون سی اور کتنی بڑی منظم تنظیم ہے جو ایک ہی دن میں سارے ہندوستان میں پرچے تقسیم ہو گئے۔ اسی کے بعد میں نے ایگزیکٹیو کی ایک میٹنگ بلائی جو مرکز خالی ہو گیا تھا وہاں ایک شخص کو مقرر کیا۔ مرکز میں کچھ تبدیلی بھی ہوئی کیوں کہ حکومت کے پاس یوپی کے بارے میں بہت سی اطلاعات پہنچ چکی تھیں۔ مستقبل کی حکمت عملی کا تعین کیا گیا۔

کارکنوں کی بدحالی

اس وقت کمیٹی کے ممبروں کی حالت بہت خراب تھی۔ چنے ملنا بھی مشکل تھا۔ سب پر کچھ نہ کچھ قرض ہو گیا تھا۔ کسی کے پاس سالم کپڑے تک نہ تھے کچھ طالب علم بن کر مذہبی مقامات پر کھانا تک کھا آتے تھے۔ چار پانچ نے اپنے اپنے مرکز چھوڑ دیے۔ پانچ سو سے زیادہ روپے قرض لے کر میں خرچ کر چکا تھا۔ یہ بری حالت دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ مجھ سے بھی بھر پیٹ کھانا نہیں کھایا جاتا تھا امداد کے لیے کچھ ہمدردوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر کورا جواب ملا۔ لاچار اور بے بس تھا (سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں) کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ نرم دل نوجوان میرے چاروں طرف بیٹھ کر کہا کرتے تھے "پنڈت جی اب کیا

کریں؟" میں اُن کے خشک خشک چہرے دیکھ کر اکثر رو پڑتا کہ خدمت وطن کا عہد کرنے کی وجہ سے فقیروں سے بھی بُری حالت ہو رہی ہے۔ ایک ایک کرتا اور دھوتی ایسی نہیں تھی جو صحیح سالم ہوتی۔ لنگوٹ باندھ کر دن گزارا کرتے تھے۔ انگوچھے پہن کر نہاتے تھے ایک وقت علاقے میں کھانا کھاتے ایک وقت دو دو پیسے کے ستو کھاتے۔ میں پندرہ سال سے ایک وقت دودھ پیتا تھا۔ ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر مجھے دودھ پینے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ میں سب کے ساتھ بیٹھ کر ستو پیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اتنے نوجوانوں کی زندگی کو برباد کر کے انھیں کہاں بھیجا جائے؟ جب کمیٹی کا ممبر بنایا تھا تو لوگوں نے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کی تھیں کبھی بھی اس طرح کی کمیٹی میں حصہ نہ لیتا۔ برا پھنسا۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر میں حوصلہ کر کے پورے عزم کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کیا۔

اسی دوران بنگال میں آر ڈی ٹینس نکلا اور گرفتاریاں ہوئیں۔ ان کی گرفتاریوں نے یہاں تک اثر ڈالا کہ کارکنوں پر مایوسی طاری ہو گئی۔ کیا انتظام کیا جائے کچھ فیصلہ نہ کر پائے۔ میں نے کوشش کی کہ ایک سو روپیہ ماہانہ کا کہیں سے انتظام ہو جائے۔ ہر مرکز کے نمائندے سے ہر طرح کی درخواست کی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں سے کچھ امداد لیں۔ ماہانہ چندہ وصول کریں لیکن کسی نے کچھ نہ سنی۔ کچھ حضرات سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ اپنی تنخواہ سے ماہانہ دے دیا کریں۔ کسی نے کچھ توجہ نہ دی۔ ممبر روز میرے دروازے پر کھڑے رہتے تھے۔ خطوں کی کھ مار تھی کہ کچھ روپیہ کا انتظام کیجئے۔ بھوکوں مر رہے ہیں۔ دو ایک کو کاروبار میں لگانے کا بھی انتظام کیا۔ دو چار ضلعوں میں کام بند کر دیا وہاں کے کارکنوں سے واضح طور پر کہہ دیا کہ ہم ماہانہ امداد نہیں دے سکتے۔ اگر گزارہ کا کوئی دوسرا راستہ ہو اور اس پر انحصار کر کے کام کر سکتے ہو تو کرو۔ ہم سے جس وقت ہو سکے گا دیں گے لیکن ماہانہ تنخواہ دینے کے ہم پابند نہیں۔ کوئی بیس روپے قرض کے مانگتا تھا کوئی پچاس کا بل بھیجتا تھا اور کچھ لوگوں نے مایوس ہو کر کام چھوڑ دیا۔ میں نے بھی سمجھ لیا ٹھیک ہی ہے لیکن اتنا کرنے پر بھی گزارہ نہ ہو سکا۔

بے چین نوجوانوں کا گروپ

کچھ حضرات کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کچھ شان دکھانا یا خود کو بڑا دکھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں جس سے خطرناک نقصانات

ہو جاتے ہیں۔ سیدھے سادے آدمی ایسے افراد پر یقین کر کے غیر معمولی حوصلہ قابلیت اور مہارت کی اُمید کر کے اُن پر عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ان کا یقین نااُمیدی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے افراد کی اگر چند اسباب کی وجہ سے کامیابی ہو گئی یا موافق حالات کے تحت انھوں نے کسی بڑے کام میں حصہ لے لیا تب تو وہ خود کو بہت بڑا کارکن ظاہر کرتے ہیں۔ عوام بھی اندھی تقلید میں اُن پر یقین کر لیتے ہیں خاص طور پر نوجوان تو ایسے افراد کے جال میں جلد ہی پھنس جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ لیڈری کے چکر میں اپنی ڈیڑھ چاول کی کھچڑی الگ پکایا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے الگ الگ جماعتیں بنتی ہیں۔ اس طرح کے افراد ہر سماج اور ہر ذات میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے انقلابی جماعت بھی آزاد نہیں رہ سکتی۔ نوجوانوں کا مزاج چنچل ہوتا ہے وہ پر سکون ہو کر تنظیمی کام کرنا بڑا مشکل سمجھتے ہیں۔ ان کے دل میں جوش کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں دو چار ہتھیار ہاتھ آئے کہ ہم نے حکومت کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ میں بھی جب انقلابی جماعت میں حصہ لینے کے لیے سوچ رہا تھا اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ اگر ایک ریوالور مل جائے تو دس بیس انگریزوں کو مار دوں۔ اسی طرح کے جذبات میں نے کئی نوجوانوں میں دیکھے۔ ان کی بڑی شدید دلی تمنا ہوتی ہے کہ کسی طرح ایک ریوالور یا پستول اُن کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اُسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میں نے اُن سے ریوالور پاس رکھنے کا فائدہ پوچھا تو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پائے۔ کئی نوجوانوں کو میں نے اس شوق کو پورا کرنے میں سینکڑوں روپے برباد کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ کسی انقلابی تحریک کے ممبر نہیں، کوئی خاص کام بھی نہیں، محض شوقیہ ریوالور پاس رکھیں گے۔ ایسے ہی چند نوجوانوں کا ایک گروپ ایک حضرت نے بھی جمع کیا تھا۔ وہ سب بڑے باکردار خوددار اور پرخلوص کارکن تھے۔ اس گروپ نے غیر ممالک سے ہتھیار حاصل کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ حاصل کیا تھا جس سے حسب خواہش کافی ہتھیار مل سکتے تھے۔ ہتھیار بھی کافی تعداد میں بالکل نئے ملتے تھے۔ یہاں تک انتظام ہو گیا تھا کہ اگر ہم لوگ روپے کا معقول انتظام کر دیں گے اور وقت پر قیمت ادا کر دیں گے تو ہم کو مال ادھار بھی مل جایا کرے گا اور ہمیں جب جس طرح کے جتنی تعداد میں ہتھیاروں کی ضرورت ہو گی، مل جایا کریں گے۔ یہی نہیں وقت آنے پر ہم خاص طرح کی مشین والی بندوقیں بھی بنوا سکیں گے۔ اس وقت سمیتی کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس ذریعہ کے ہاتھ لگ جانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی خواہش

ہونے پر بھی بغیر روپے کے کچھ ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ روپیہ کا انتظام کرنا بہت ضروری تھا۔ لیکن وہ ہو کیسے؟ خیرات کوئی دیتا نہ تھا۔ قرض بھی نہ ملتا تھا اور کوئی طریقہ نہ دیکھ ڈاکہ ڈالنا طے ہوا۔ لیکن کسی فرد واحد کی جائیداد پر ڈاکہ ڈالنا ہمیں ٹھیک نہ لگتا تھا۔ سوچا اگر لوٹنا ہے تو سرکاری مال کیوں نہ لوٹا جائے؟ اسی اُدھیڑ بُن میں ایک دن میں ریل میں جا رہا تھا۔ گارڈ کے ڈبے کے پاس والے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر ایک تھیلی لایا اور گارڈ کے ڈبے میں ڈال گیا۔ کچھ کھٹ پٹ کی آواز ہوئی۔ میں نے اتر کر دیکھا کہ ایک لوہے کا صندوق رکھا ہے۔ سوچا اس میں تھیلی ڈالی ہوگی۔ اگلے اسٹیشن پر اس میں تھیلی ڈالتے بھی دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ لوہے کا صندوق گارڈ کے ڈبے میں زنجیر سے بندھا رہتا ہوگا۔ تالا پڑا رہتا ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر تالا کھول کر اُتار لیتے ہوں گے۔ اس کے تھوڑے دن بعد لکھنؤ اسٹیشن پر جانے کا موقع ملا دیکھا ایک گاڑی میں سے قلی لوہے کے آمدنی والے صندوق اُتار رہے ہیں۔ معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس میں زنجیر تالا کچھ نہیں پڑتا، ایسے ہی رکھے جاتے ہیں۔ اسی وقت طے کیا کہ اسی پر ہاتھ ماروں گا۔

ریلوے ڈکیتی (کاکوری)

اسی وقت سے دھن سوار ہوئی۔ فوراً مقام پر جا کر ٹائم ٹیبل دیکھ کر اندازہ لگایا کہ سہارنپور سے گاڑی چلتی ہے۔ لکھنؤ تک یقیناً دس ہزار روپے روز کی آمدنی ہوتی ہوگی۔ سب باتیں ٹھیک کر کے کارکنوں کو جمع کیا۔ دس نوجوانوں کو لے کر سوچا کہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی ہو اسٹیشن کے تار گھر پر قبضہ کر لیں اور گاڑی کا صندوق اُتار کر توڑ ڈالیں، جو کچھ ملے اُسے لے کر چل دیں، لیکن اس کام میں زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی اس کی وجہ سے یہ طے کیا کہ گاڑی کی زنجیر کھینچ کر چلتی گاڑی کو کھڑا کر کے تب لوٹا جائے۔ ممکن ہے کہ تیسرے درجے کی زنجیر کھینچنے سے گاڑی کھڑی نہ ہو۔ کیوں کہ تیسرے درجے میں اکثر انتظام ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے دوسرے درجے کی زنجیر کھینچنے کا انتظام کیا۔ سب لوگ اسی ٹرین میں سوار تھے۔ گاڑی کھڑی ہونے پر سب اتر کر گارڈ کے ڈبے کے پاس پہنچ گئے۔ لوہے کا صندوق اُتار کر چھینیوں سے کاٹنا چاہا، چھینیوں نے کام نہ کیا تب کلہاڑا چلایا۔ مسافروں سے کہہ دیا کہ سب گاڑی میں چڑھ جاؤ۔ گاڑی کا گارڈ گاڑی میں چڑھنا چاہتا تھا لیکن اسے زمین پر لیٹ جانے کا حکم

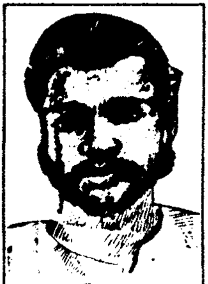

منمتھ ناتھ گپت

دیا تا کہ بغیر گارڈ کے گاڑی نہ جاسکے۔ دو آدمیوں کو مقرر کیا کہ وہ لائن کی پگڈنڈی کو چھوڑ کر گھاس میں کھڑے ہو کر گاڑی سے ہٹے ہوئے گولی چلاتے رہیں۔ ایک صاحب گارڈ کے ڈبے سے اُترے۔ ان کے پاس بھی ماؤزر پستول تھا۔ سوچا کہ ایسا اچھا موقع کب ہاتھ آئے۔ ماؤزر پستول کب چلانے کو ملے گا؟ اُمنگ جو آئی سیدھی کر کے داغنے لگے۔ میں نے جو دیکھا تو ڈانٹا کیوں کہ گولی چلانے کی ان کی ڈیوٹی ہی نہیں تھی۔ پھر اگر کوئی مسافر تجسس کی وجہ سے باہر کو سر نکالے تو اس کو گولی ضرور لگ جائے۔ ہوا بھی ایسا ہی، جو صاحب ریل سے اتر کر اپنی بیوی کے پاس جا رہے تھے، میرا خیال ہے کہ انھیں حضرت کی گولی ان کو لگ گئی کیوں کہ جس وقت یہ حضرت صندوق نیچے ڈال کر گارڈ کے ڈبے سے اُترے تھے صرف دو تین فائر ہوئے تھے۔ اسی وقت عورت نے شور مچایا ہوگا اور اس کا شوہر اس کے پاس جا رہا تھا جو اُن حضرت کے جوش کا شکار ہو گیا۔ میں نے اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ بندوبست کیا تھا کہ جب تک کوئی بندوق لے کر سامنا کرنے نہ آئے یا مقابلے میں گولی نہ چلے تب تک کسی آدمی پر فائر نہ کیا جائے۔ میں انسانی قتل کر کے ڈاکے کو خوفناک شکل دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرا کہنا نہ مان کر اپنا کام چھوڑ کر گولی چلا دینے کا یہ نتیجہ ہوا۔ گولی چلانے کی ڈیوٹی جن کو میں نے دی تھی وہ بڑے ماہر اور تجربے کار آدمی تھے ان سے غلطی ہونا ناممکن ہے۔ ان لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے مقام سے پانچ منٹ بعد پانچ فائر کرتے تھے۔ یہی میرا حکم تھا۔

بھوپیندر ناتھ سانیال

صندوق توڑ کر تین گٹھریوں میں تھیلیاں باندھیں۔ سب سے کئی بار کہا۔ دیکھ لو کوئی سامان رہ تو نہیں گیا۔ اس کے باوجود ایک صاحب چادر چھوڑ آئے۔ راستے میں تھیلیوں میں سے روپیہ نکال کر گٹھری باندھی اور اسی وقت لکھنؤ شہر میں آ پہنچے۔ کسی نے پوچھا بھی نہیں کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ اس طرح دس آدمیوں نے ایک گاڑی کو لوٹ لیا۔ اس گاڑی میں چودہ آدمی ایسے تھے جن کے پاس بندوق یا رائفلیں تھیں۔ دو انگریز ہتھیار بند فوجی جوان بھی تھے لیکن سب خاموش رہے۔ ڈرائیور صاحب اور ایک انجینئر صاحب کا برا حال تھا۔ وہ دونوں انگریز تھے۔ ڈرائیور صاحب انجن میں لیٹے رہے۔ انجینئر صاحب پاخانے میں جا چھپے۔ ہم نے کہہ دیا تھا کہ مسافروں سے کچھ نہ کہیں گے صرف حکومت کا مال لوٹیں گے۔ اسی وجہ سے مسافر بھی خاموش بیٹھے رہے۔ سمجھے کہ تیس چالیس آدمیوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ صرف دس افراد نے اتنی بڑی دہشت پھیلا دی۔ عام طور پر اس بات پر بہت سے لوگ یقین کرنے میں بھی ہچکچائیں گے کہ دس نوجوانوں نے گاڑی کھڑی کر کے لوٹ لی جو بھی ہو، اصلیت یہی تھی۔ ان دس کارکنوں میں زیادہ تر تو ایسے تھے جو عمر میں تقریباً 22 سال کے ہوں گے اور جو جسمانی طور پر بہت زیادہ طاقتور بھی نہ تھے۔ اس کامیابی کو دیکھ کر میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ میرا جو خیال تھا وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ پولیس والوں کی بہادری کا مجھے اندازہ تھا۔ اس واقعہ سے مستقبل میں کام کرنے کی بڑی امید پیدا ہوئی۔ نوجوانوں کا بھی حوصلہ بڑھا۔ جتنا قرض ہوا تھا وہ ادا کر دیا گیا۔ ہتھیاروں کی خرید کے لیے تقریباً ایک ہزار روپئے بھیج دیئے۔ ہر مرکز کے کارکنوں کو ان کے مقام پر بھیج کر دوسرے صوبوں میں بھی کام پھیلانے کا فیصلہ کر کے کچھ بندوبست کیا۔ نوجوانوں کے ایک گروپ نے بم بنانے کا فیصلہ کیا۔ مجھ سے بھی مدد مانگی میں نے مالی امداد دے کر ایک نمائندہ بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن کچھ غلطیاں ہوئیں جس کی وجہ سارا گروپ بکھر گیا۔

میں اس بارے میں کچھ بھی نہ جان سکا کہ دوسرے ملکوں کے انقلابیوں نے ابتدائی دور میں ہم لوگوں کی طرح کوشش کی تھی یا نہیں۔ اگر کافی تجربہ ہوتا تو ایسی فاش غلطیاں نہ ہوتیں۔ غلطیوں کے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ بگڑتا اور نہ بھید کھلتا نہ اس حالت کو پہنچتے کیوں کہ میں نے جو تنظیم کی تھی اس میں کسی طرف سے مجھے کمزوری نہ دکھائی دیتی تھی۔ کوئی شخص کسی طرح کی

غلطی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے آنکھ بند کر کے بیٹھے رہے۔ لیکن آستین میں سانپ چھپا ہوا تھا ایسا گہرا منہ مارا کہ چاروں خانے چت کر دیا۔

جنھیں ہم ہار سمجھے تھے گلا اپنا سجانے کو
وہی اب ناگ بن بیٹھے ہمارے کاٹ کھانے کو

نوجوانوں میں آپس کی کشاکش کی وجہ سے بہت تکرار اور رنجش بھی ہو جاتی تھی، جو خوفناک شکل اختیار کر لیتی تھی۔ میرے پاس جب معاملہ آتا تو میں شفقت سے کمیٹی کی حالت کو دیکھ کر سب کو خاموش کر دیتا۔ کبھی قیادت کو لے کر بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا۔ ایک مرکز کے معائنہ کار سے وہاں کے کارکن بہت ناخوش تھے۔ کیوں کہ معائنہ کار سے ناتجربے کاری کی وجہ سے کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر بڑی مایوسی اور تعجب ہوا کیوں کہ لیڈری کا چکر سب سے خطرناک ہوتا ہے۔ جس وقت سے یہ بھوت دماغ پر سوار ہوتا ہے اُس وقت سے سارا کام چوپٹ ہو جاتا ہے۔ صرف ایک دوسرے کی خامیاں تلاش کرنے میں وقت گزرتا ہے اور کشاکش بڑھنے کے بڑے خوفناک نتائج ہوتے ہیں۔ اس طرح کی خبریں سن کر میں نے سب کو جمع کیا اور خوب ڈانٹا۔ سب اپنی غلطیوں کو جان کر شرمندہ ہوئے اور محبت سے آپس میں مل کر کام کرنے لگے۔ لیکن ایسی حالت ہو گئی تھی کہ گروپ بازی کی نوبت آگئی تھی۔ اس طرح سے تو گروپ بندی ہو ہی گئی تھی۔ لیکن میرا سب احترام کرتے تھے اور میری رائے کو سب مان لیتے تھے سب کچھ ہونے کے باوجود مجھے کسی طرف سے کوئی شک نہ تھا۔ لیکن خدا کو ایسا ہی منظور تھا جو یہ حالت دیکھنی پڑی۔

گرفتاری

کاکوری ڈکیتی ہونے کے بعد سے ہی پولیس بہت ہوشیار ہو گئی تھی بڑے زور شور سے جانچ شروع کی گئی۔ شاہ جہاں پور میں کچھ نئے افراد نظر آئے۔ پولیس کے کچھ خاص افراد مجھ سے بھی ملے۔ چاروں طرف شہر میں اس کا ذکر تھا کہ ریلوے ڈکیتی کس نے کر لی؟ انھیں دنوں شہر میں ڈکیتی کے ایک دو نوٹ نکل آئے اب تو پولیس کی جانچ پڑتال اور بھی بڑھنے لگی۔

کئی دوستوں نے مجھ سے کہا کہ ہوشیار رہو۔ دو ایک افراد نے یقینی خبر دی کہ میری گرفتاری ہو جائے گی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر گرفتاری ہو بھی گئی تو پولیس کو میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ اپنی عقل مندی پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا۔ اپنی عقل کے سامنے دوسروں کی عقل کو کم تر سمجھتا تھا۔ کچھ یہ بھی خیال تھا کہ ملک کی ہمدردی کا امتحان لیا جائے۔ جس ملک کے لیے ہم قربانی دینے کو تیار ہیں اس ملک کے باشندے ہمارے لیے کتنی ہمدردی رکھتے ہیں؟ کچھ جیل کا تجربہ بھی حاصل کرنا تھا۔ درحقیقت کام کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ مستقبل کے کاموں میں زیادہ انسانی قتل کا خیال کر کے میں بدحواس سا ہو گیا تھا میں نے کسی کے کہنے کی کوئی فکر نہ کی۔

رات کے وقت تقریباً گیارہ بجے ایک دوست کے یہاں سے اپنے گھر پر گیا۔ راستے میں خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے ملاقات ہوئی۔ کچھ خصوصی طور پر اس وقت بھی وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے کوئی فکر نہ کی اور گھر پر جا کر سو گیا۔ صبح چار بجے بیدار ہوا۔ حوائج ضروری سے فراغت کے بعد باہر دروازے پر بندوق کے کندوں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس آ گئی ہے۔ میں فوراً دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ایک پولیس آفیسر نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ میں گرفتار ہو گیا۔ میں صرف ایک انگوچھا پہنے ہوئے تھا۔ پولیس والے کو زیادہ ڈر نہ تھا۔ پوچھا گھر میں کوئی ہتھیار ہو تو دے دیجیے۔ میں نے کہا کہ گھر میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ وہ بڑی شرافت سے پیش آئے۔ میرے ہتھکڑی وغیرہ کچھ نہ ڈالی۔ مکان کی تلاشی لیتے وقت ایک خط مل گیا جو میری جیب میں تھا۔ ہونے والی بات تھی تین چار خط میں نے لکھے تھے۔ ڈاک خانے میں ڈالنے کو بھیجے اس وقت تک ڈاک نکل چکی تھی۔ میں نے وہ سب اس خیال سے اپنے پاس ہی رکھ لیے کہ ڈاک کی چٹی میں ڈال دوں گا۔ پھر سوچا جیسے چٹی میں پڑے رہیں گے ویسے جیب میں پڑے ہیں۔ میں ان خطوں کو گھر لے آیا۔ ان ہی میں سے ایک خط قابل اعتراض تھا جو پولیس کے ہاتھ لگا۔ گرفتار ہو کر پولیس کوتوالی پہنچا۔ وہاں پر خفیہ پولیس کے ایک افسر سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت انھوں نے کچھ ایسی باتیں کیں جنھیں میں یا ایک اور فرد جانتا تھا کوئی تیسرا فرد اس طرح سے تفصیلات نہیں جان سکتا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا لیکن شک اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ میں اس فرد پر اپنے جسم کی طرح ہی بھروسہ کرتا تھا۔ شاہ جہاں پور میں جن جن افراد کی گرفتاری ہوئی وہ بھی بڑی حیرت انگریز

محسوس ہوتی تھی۔ جن پر کوئی شبہ بھی نہ تھا پولیس انھیں کیسے جان گئی؟ دوسرے مقامات پر کیا ہوا کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا۔ جیل پہنچ جانے کے بعد تھوڑا بہت اندازہ ہو سکا کہ غالباً دوسرے مقامات پر بھی گرفتاریاں ہوئی ہوں گی۔ کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جیل میں ہم لوگوں کے پاس خبریں بھیجنے کا انتظام کر دیتا۔

جیل

جیل میں پہنچتے ہی خفیہ پولیس والوں نے یہ انتظام کرلیا کہ ہم سب ایک دوسرے سے الگ رکھے جائیں، لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے بات چیت ہو جاتی تھی۔ اگر عام قیدیوں کے ساتھ رکھتے تو بات چیت کا پورا انتظام ہو جاتا۔ اس وجہ سے سب کو الگ الگ تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ یہ انتظام دوسرے ضلعے کی جیلوں میں بھی، جہاں جہاں بھی اس سلسلے میں گرفتاریاں ہوئی تھیں کیا گیا تھا۔ الگ الگ رکھنے سے پولیس کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ ہر ایک سے الگ الگ مل کر بات چیت کرتے ہیں۔ کچھ ڈراتے دھمکاتے ہیں کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے بھید جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجربہ کار افراد تو پولیس والوں سے ملنے سے انکار ہی کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان سے ملنے پر نقصان کے علاوہ فائدہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو خبریں معلوم کرنے کے لیے کچھ بات چیت کرتے ہیں۔ پولیس والوں سے ملنا ہی کیا ہے؟ وہ تو چالبازی سے بات نکالنے ہی کی روٹی کھاتے ہیں۔ ان کی زندگی اسی طرح کی باتوں میں گزرتی ہے۔ نوجوان دنیاداری کیا جانیں؟ نہ وہ اس طرح کی باتیں ہی بنا سکتے ہیں۔

جب کسی طرح کچھ خبریں ہی نہ ملتیں تب تو دل بہت گھبراتا۔ یہی پتہ نہیں چلتا کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ قسمت کا کیا فیصلہ ہوگا؟ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا اتنی ہی فکر بڑھتی جاتی تھی۔ جیل کے عہدے داروں سے مل کر پولیس یہ بھی بندوبست کر دیتی ہے کہ ملاقات کرنے والوں سے گھر کے بارے میں بات چیت کریں مقدمے کے بارے میں کوئی بات چیت نہ کریں۔ آسانی کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ایک قابل اعتماد وکیل کیا جائے جو ٹھیک وقت پر آ کر بات چیت کر سکے۔

وکیل کے لیے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ وکیل کے ساتھ ملزم کے ساتھ جو باتیں ہوتی ہیں ان کو کوئی دوسرا سن نہیں سکتا۔ کیوں کہ اس طرح کا قانون ہے یہ تجربہ بعد میں ہوا۔ گرفتاری کے بعد شاہ جہاں پور کے وکیلوں سے ملنا بھی چاہا لیکن

شاہ جہاں پور میں ایسے دو وکیل رہتے ہیں جو حکومت کے خلاف مقدمے میں مدد دینے سے ہچکچاتے ہیں۔

مجھے خفیہ پولیس کے کپتان صاحب ملے۔ تھوڑی سی باتیں کر کے اپنی خواہش ظاہر کی کہ مجھے سرکاری گواہ بنانا چاہتے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں ایک دوست نے خوف زدہ ہو کر کہ کہیں وہ بھی نہ پکڑا جائے بنارسی لال سے ملاقات کی اور سمجھا بجھا کر اسے سرکاری گواہ بنا دیا۔ بنارسی لال بہت گھبرایا ہوا تھا کہ کون مدد کرے گا سزا ضرور ہو جائے گی۔ اگر کسی وکیل سے مل لیا ہوتا تو اس کا حوصلہ نہ ٹوٹتا۔ پنڈت ہر کرن ناتھ شاہ جہاں پور آئے۔ جس وقت وہ، ملزم شری پریم کرشن کھنہ سے ملے، اس وقت ملزم نے پنڈت ہر کرن ناتھ سے بہت کچھ کہا کہ مجھ سے اور دوسرے ملزموں سے مل لیں۔ اگر وہ کہنا مان لیتے تو بنارسی لال کا حوصلہ ہو جاتا اور وہ ڈٹا رہتا۔ اسی رات کو پہلے ایک انسپکٹر بنارسی لال سے ملے۔ پھر جب میں سو گیا تب بنارسی لال کو نکال کر لے گئے۔ صبح پانچ بجے کے قریب جب بنارسی لال کی کوٹھری میں سے کچھ الفاظ سنائی دیئے تو میں نے بنارسی لال کو پکارا۔ پہرے پر جو قیدی تھ اس سے معلوم ہوا بنارسی لال بیان دے چکے ہیں۔ بنارسی لال کے بارے میں سب دوستوں نے کہا تھا کہ اس سے ضرور دھوکا ہو گا لیکن میری عقل میں نہ آیا۔ ہر واقف کار نے بنارسی لال کے بارے میں یہی پیش گوئی کی تھی کہ یہ مصیبت پڑنے پر ثابت قدم نہ رہ سکے گا۔ اسی وجہ سے سب نے اسے کسی خفیہ کام میں لینے سے منع کیا تھا۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

تھوڑے دنوں بعد ضلع کلکٹر ملے۔ کہنے لگے پھانسی ہو جائے گی۔ بچنا ہو تو بیان دے دو۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد خفیہ پولیس کے کپتان ملے۔ بہت سی باتیں کیں۔ کئی کاغذات دکھائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کتنی دور تک یہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔ میں نے کچھ باتیں بنائیں تاکہ پولیس کا دھیان دوسری طرف چلا جائے لیکن ان کے ہاتھ ناقابل تردید ثبوت لگ چکے تھے وہ بناوٹی باتوں پر کیوں یقین کرتے؟ آخر میں انھوں نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر میں بنگال کا تعلق بتا کر کچھ بولشویک تعلقات کے بارے میں اپنا بیان دے دوں تو وہ مجھے تھوڑی سی سزا دیں گے اور سزا کے تھوڑے دنوں بعد جیل سے نکال کر انگلینڈ بھیج دیں گے اور پندرہ ہزار روپے سرکار سے انعام بھی دلوا دیں گے۔ میں دل ہی دل میں ہنستا تھا۔

آخر میں پھر مجھ سے خفیہ پولیس کے کپتان صاحب جیل میں ملنے آئے۔ میں نے اپنی کوٹھری میں سے نکلنے سے ہی انکار کر

دیا۔ وہ کوٹھری پر آکر بہت سی باتیں کرتے رہے اور آخر کار پریشان ہو کر چلے گئے۔

شناخت کرائی گئی۔ پولیس کو جتنے آدمی مل سکے اتنے آدمی لے کر شناخت کرائی۔ خوبی قسمت جناب عین الدین صاحب مقدمے کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے انھوں نے جی بھر کے پولیس کی مدد کی۔ شناخت میں ملزموں کو عام مجسٹریٹوں کی طرح بھی سہولیات نہ دیں۔ دکھانے کے لیے کاغذی کارروائی خوب صاف رکھی۔ زبان کے بڑے میٹھے تھے۔ ہر ملزم سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ سب سمجھتے تھے کہ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ کوئی نہ سمجھ سکا کہ اندر ہی اندر زخم لگا رہے ہیں۔ اتنا چالاک افسر شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ جب تک مقدمہ ان کی عدالت میں رہا کسی کو کوئی شکایت کا موقع ہی نہ دیا۔ اگر کبھی کوئی بات ہو بھی جاتی تو ایسے ڈھنگ سے اسے ٹالنے کی کوشش کرتے کہ کسی کو برا ہی نہ لگتا۔ اکثر ایسا ہی ہوا کہ کھلی عدالت میں ملزموں سے معافی تک مانگنے میں بھی ہچکچاہٹ نہ کی۔ لیکن کاغذی کارروائی میں اتنے ہوشیار تھے کہ جو کچھ لکھا ہمیشہ ملزموں کے خلاف لکھا۔ جب معاملہ سیشن کے سپرد کیا فیصلہ میں دلائل دیے تب سب کی آنکھیں کھلیں کہ کتنا گہرا زخم لگایا ہے۔

مقدمہ عدالت میں نہ آیا تھا اس وقت رائے بریلی میں بنواری لال کی گرفتاری ہوئی۔ مجھے حال معلوم ہوا۔ میں نے پنڈت ہرکرن ناتھ سے کہا کہ سب کام چھوڑ کر سیدھے رائے بریلی جائیں اور براہ راست بنارسی لال سے ملیں لیکن انھوں نے میری بات پر توجہ نہ دی۔ مجھے بنارسی لال پر پہلے ہی شک تھا کیوں کہ اس کا رہن سہن اس طرح کا تھا جو مناسب نہ تھا۔ جب دوسرے ممبروں کے ساتھ رہتا تھا تب ان سے کہتا تھا کہ میں ضلع کا منتظم ہوں میرا شمار عہدے داروں میں ہے۔ میرا حکم مانا کرو۔ میرے جھوٹے برتن صاف کیا کرو۔ کچھ عیش پسند بھی تھا۔ ہر وقت شیشہ کنگھا اور صابن ساتھ رکھتا تھا۔ مجھے اس سے ڈر تھا لیکن ہمارے گروپ کے ایک خاص آدمی کا وہ منظور نظر رہ چکا تھا۔ انھوں نے سینکڑوں روپیہ دے کر اس کی مدد کی تھی۔ اسی وجہ سے ہم لوگ بھی اسے آخر تک ماہانہ امداد دیتے رہے۔ میں نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے لیکن کچھ بھی نہ چلی اور جس کا مجھے خطرہ تھا وہی ہوا۔ کرایے کا ٹٹو زیادہ بوجھ نہ برداشت کر سکا اس نے بیان دے دیا۔ جب تک یہ گرفتار نہ ہوا تھا کچھ ممبروں نے اس کے پاس جو ہتھیار تھے وہ مانگے لیکن اس نے نہ دیے۔ ضلع افسر کی شان میں رہا۔ گرفتار ہوتے ہی سب شان مٹی میں مل گئی۔ بنواری لال کے بیان

دے دینے سے پولیس کا مقدمہ مضبوط ہو گیا اگر وہ اپنا بیان نہ دیتا تو مقدمہ بہت کمزور تھا۔ سب لوگ چاروں طرف سے جمع کر کے لکھنؤ ضلع جیل میں رکھے گئے۔ تھوڑے عرصے تک الگ الگ رہے لیکن عدالت میں مقدمہ آنے سے پہلے ہی یکجا کر دیے گئے۔

مقدمے میں روپے کی ضرورت تھی۔ ملزموں کے پاس تھا ہی کیا؟ ان کے لیے روپیہ جمع کرنا کتنا دشوار تھا۔ نہ جانے کس طرح گزارہ کرتے تھے۔ زیادہ تر ملزموں کا کوئی رشتہ دار پیروی بھی نہ کر سکا۔ جس کسی کا کوئی تھا بھی وہ بال بچوں اور گھر کو سنبھالتا یا اتنے عرصے تک گھر بار کو چھوڑ کر مقدمہ کرتا؟ اگر چار اچھے پیروی کرنے والے ہوتے تو پولیس کا تین چوتھائی مقدمہ ٹوٹ جاتا۔ لکھنؤ جیسے شہر میں مقدمہ ہوا جہاں عدالت میں کوئی بھی شہر کا آدمی نہ آتا تھا۔ اتنا بھی تو نہ ہوا کہ ایک اچھا پریس رپورٹر ہی ہوتا جو مقدمہ کی ساری کارروائی جو کچھ عدالت میں ہوتی تھی پریس میں بھیجتا رہتا۔ انڈین ڈیلی ٹیلی گراف والوں نے مہربانی کی۔ اگر کوئی اچھا رپورٹر آ بھی گیا اور کچھ عدالت کی کارروائی ٹھیک ٹھیک شائع ہوئی تو پولیس والوں نے جج صاحب سے مل کر فوراً اس رپورٹر کو نکلوا دیا۔ عوام کی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ جو پولیس کے جی میں آیا کرتی رہی۔ ان ساری باتوں کو دیکھ کر جج کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے جیسا چاہا سب کچھ کیا۔ ملزم چلاتے ہائے ہائے! لیکن کچھ بھی سنوائی نہ ہوئی۔ اور باتیں تو دور شری دامودر سیٹھ کو پولیس نے جیل میں مار دیا۔ تقریباً ایک سال تک تڑپتے رہے۔ سوکھ کر صرف چھیاسٹھ پونڈ وزن رہ گیا۔ کئی بار جیل میں مردوں جیسی حالت ہو گئی۔ روز بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ تقریباً دس دن تک کچھ بھی کھانا نہ کھا سکے۔ جو کچھ چھٹانک دو چھٹانک دودھ کسی طرح پیٹ میں پہنچتا تھا اس سے اس طرح کا سخت درد ہوتا تھا کہ کوئی ان کے پاس کھڑا ہو کر ان کا تڑپنا دیکھ نہ سکتا تھا۔ ایک میڈیکل بورڈ بنایا گیا جس میں تین ڈاکٹر تھے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو کہہ دیا کہ سیٹھ جی کو بیماری ہی نہیں ہے۔

جب سے کاکوری سازش کیس کے ملزم ایک ساتھ جیل میں رہنے لگے تب سے اُن میں ایک عجیب تبدیلی ہوئی جسے دیکھ کر میری حیرت کی حد نہ رہی۔ جیل میں سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ہر آدمی اپنی لیڈری کی دہائی دیتا تھا کوئی بھی چھوٹے بڑے کا فرق نہ رہا۔ بزرگوں اور تجربے کار لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ نظم و ضبط کا نام نہ تھا۔ اکثر الٹے سیدھے جواب ملنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف ہونے لگا۔ اس طرح کا اختلاف کبھی کبھی رنجش کا سبب بننے لگا آپس میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔

جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہاں کھٹک بھی جاتے ہیں یہ لوگ تو انسان ہی تھے۔

ایک بار سوچا کہ حکومت سے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ بیرسٹر صاحب نے پولیس کے کپتان سے صلاح مشورہ شروع کر دیا لیکن یہ سوچ کر کہ اس سے انقلابی جماعت کا وجود نہ مٹ جائے یہ خیال چھوڑ دیا۔ نوجوانوں کی رائے ہوئی کہ بھوک ہڑتال کر کے حکومت سے حوالاتی کی حالت میں ہی مانگیں پوری کرالی جائیں کیوں کہ لمبی لمبی سزائیں ہوں گی۔ یوپی کی جیلوں میں عام قیدیوں کا کھانا کھاتے ہوئے سزا کاٹ کر جیل سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ جتنے سیاسی قیدی سازش کے بارے میں سزا پاکر اس صوبے کی جیلوں میں رکھے گئے اُن میں سے پانچ چھ حضرات نے اس صوبے کی جیلوں کے برتاؤ کی وجہ سے ہی جیلوں میں جان دے دی۔

اس خیال کے تحت کاکوری کے تقریباً تمام حوالاتیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ دوسرے ہی دن سب الگ کر دیے گئے۔ کچھ افراد ڈسٹرکٹ جیل میں رکھے گئے۔ کچھ سینٹرل جیل میں بھیجے گئے۔ بھوک ہڑتال کرتے ہوئے پندرہ دن گزر گئے تب حکومت کے کان پر جوں رینگی۔ ادھر حکومت کا کافی نقصان ہو رہا تھا۔ جج صاحب اور دوسرے کچہری کے ملازموں کو گھر بیٹھے تنخواہ دینی پڑتی تھی۔ حکومت کو خود فکر تھی کہ کس طرح بھوک ہڑتال ختم ہو۔ جیل عہدے داروں نے پہلے آٹھ آنے روز طے کیے۔ میں نے اس سمجھوتے کو نامنظور کر دیا اور بڑی مشکل سے دس آنے روز پر لے آیا۔ اس بھوک ہڑتال میں پندرہ دن تک میں نے پانی پی کر گزارہ کیا۔ سولہویں دن ناک سے دودھ پلایا گیا۔ شری روشن سنگھ جی نے بھی اسی طرح میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ پندرہ دن تک برابر چلتے پھرتے رہے۔ نہا دھو کر اپنا روزمرہ کا کام بھی کر لیا کرتے تھے۔ دس دن تک تو میرے منھ کو دیکھ کر انجان آدمی یہ بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں اناج نہیں کھاتا۔ جس دن صفائی کی بحث میں نے ختم کی

ٹھاکر روشن سنگھ

سرکاری وکیل نے اُٹھ کر میری بحث کی بہت زیادہ تعریف کی کہ سینکڑوں وکیلوں سے اچھی بحث کی ہے۔ میں نے سلام کر کے جواب دیا کہ سب آپ کے قدموں کا طفیل ہے کیوں کہ اس مقدمے سے پہلے میں نے کسی عدالت میں وقت نہ گزارا تھا سرکاری اور وکیل صفائی کی جرح کو سن کر میں نے بھی ہمت کی۔

مقدمہ

کاکوری میں ریلوے ٹرین لٹ جانے کے بعد ہی پولیس کا خاص محکمہ اس حادثے کا پتہ لگانے کے لیے تعینات کیا گیا۔ ایک خاص شخص مسٹر ہارٹن اس محکمے کے سپروائزر تھے۔ انھوں نے جائے وقوع اور ریلوے پولیس کی رپورٹوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ عین ممکن ہے کہ یہ کام انقلابیوں کا ہو۔ صوبے کے انقلابیوں کی جانچ شروع ہوئی۔ اسی وقت شاہ جہاں پور میں ریلوے ڈکیتی کے تین نوٹ ملے۔ چوری گئے نوٹوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی جن کی قیمت تقریباً ایک ہزار روپے ہوگی۔ ان میں سے تقریباً سات سو یا آٹھ سو روپے قیمت کے نوٹ سیدھے سرکاری خزانے میں پہنچ گئے۔ اس لیے حکومت نوٹوں کے معاملے کو خاموشی سے پی گئی۔ یہ نوٹ فہرست شائع ہونے سے پہلے ہی سرکاری خزانے میں پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا لسٹ شائع کرنا فضول ہوا۔ سرکاری خزانے میں ہی سے کچھ نوٹ فہرست شائع ہونے سے پہلے ہی عوام کے پاس پہنچ چکے تھے جس کی وجہ سے وہ عوام کے پاس نکل آئے۔

انھیں دنوں ضلع خفیہ پولیس کو معلوم ہوا کہ میں 9،8 اور 10 اگست 1925ء کو شاہ جہاں پور میں نہیں تھا۔ اور زیادہ جانچ ہونے لگی۔ اسی جانچ پڑتال کے دوران معلوم ہوا کہ گورنمنٹ اسکول شاہ جہاں پور کے اندر بھوشن متر نام کے ایک طالب علم کے پاس میری انقلابی جماعت سے متعلق خطوط آتے تھے۔ جو مجھے دبے آتا ہے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے ذریعے اندر بھوشن کے پاس آئے ہوئے خطوط کی نقل کرا کے ہارٹن صاحب کے پاس بھیجی جاتی رہی۔ ان خطوط سے ہارٹن صاحب کو معلوم ہوا کہ میرٹھ میں انقلابی کمیٹی کی ایک میٹنگ ہونے والی ہے۔ انھوں نے ایک سب انسپکٹر کو میرٹھ اتاتھ آلیہ جہاں پر بیٹھک ہونے کا پتہ چلا تھا بھیجا۔ انھی دنوں ہارٹن صاحب کو کسی خاص ذریعے سے معلوم ہوا کہ جلد ہی کہیں کھل میں ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے انقلابی کمیٹی کے

ممبر کر رہے تھے۔اور ممکن ہے کہ کسی بڑے شہر میں ڈاک خانے کی آمدنی لوٹی جائے۔

بارٹن صاحب کو ایک ذریعہ سے ایک خط ملا جو میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔اس خط میں ستمبر میں ہونے والے شرادھ (مٹنگ) کا ذکر تھا۔ جس کی 13 تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ خط میں لکھا تھا کہ شرادھ نمبر-1 پر 13 تاریخ کو ہوگا ضرور تشریف لائیے۔ اناتھ آلیہ میں طلوں کا خط پر رودر کے دستخط تھے۔

آئندہ ڈاکوؤں کو روکنے کے لیے بارٹن صاحب نے صوبے بھر میں 26 ستمبر 1925، کو تقریباً تیس افراد کو گرفتار کیا۔ انہی دنوں اندر بھوشن کے پاس آئے ہوئے خط سے پتہ لگا کہ کچھ چیزیں بنارس میں کسی طالب علم کی کوٹھری میں بند ہیں۔ اندازہ لگایا گیا کہ ممکن ہے کہ ہتھیار ہوں۔ تحقیق کرنے سے ہندو یونی ورسٹی کے ایک طالب علم کی کوٹھری سے دو رائفلیں نکلیں۔ اس طالب علم کو کانپور میں گرفتار کیا گیا۔ اندر بھوشن نے میری گرفتاری کی خبر ایک خط کے ذریعے بنارس بھیجی۔ جس کے پاس خط بھیجا تھا اسے پولیس گرفتار کر چکی تھی کیوں کہ اسی شری رام ناتھ پانڈے کے پتے کا خط میری گرفتاری کے وقت میرے مکان سے ملا تھا۔ رام ناتھ پانڈے کے خطوط پولیس کے پاس پہنچے تھے۔ اس لیے اندر بھوشن کو گرفتار کیا گیا۔ اندر بھوشن نے دوسرے دن اپنا بیان دے دیا۔ گرفتار کیے ہوئے افراد میں سے چھ سے مل ملا کر بنارسی داس نے بھی جو شاہ جہاں پور کی جیل میں تھا اپنا بیان دے دیا اور یہ سرکاری گواہ بنا لیا گیا۔

راجندر لاہیڑی

وہ کچھ زیادہ جانتا تھا۔ اس کے بیان سے انقلابی خطوط کے پارسلوں کا پتہ چلا۔ بنارس کے ڈاک خانے سے جن جن کے پاس پارسل بھیجے گئے تھے ان کو پولیس نے گرفتار کرایا۔ کانپور میں گوپی ناتھ نے جس کے نام سے پارسل گیا تھا گرفتار ہوتے ہی پولیس کو بیان

رام کرشن کھتری

دے دیا اور سرکاری گواہ بنالیا گیا۔ اسی طرح رائے بریلی میں اسکول کے طالب علم کنور بہادر کے پاس پارسل آیا تھا اس نے بھی گرفتار ہوتے ہی بیان دے دیا اور سرکاری گواہ بنالیا گیا۔ ان کے پاس منی آرڈر بھی آیا کرتے تھے کیوں کہ وہ بنواری لال کا پوسٹ بکس (ڈاک پانے والا) تھا۔ اس نے بنواری لال نے ایک رشتے دار کا پتہ بتادیا جہاں تلاشی لینے سے بنواری لال کا ایک ٹرنک ملا۔ اس ٹرنک میں ایک کارتوسی پستول، ایک کارتوسی فوجی ریوالور اور کچھ کارتوس پولیس کے ہاتھ لگے۔ شری بنواری لال کی تلاشی ہوئی۔ بنواری لال بھی پکڑ لئے گئے۔ گرفتاری کے کچھ دنوں بعد ہی پولیس والے ملے ان سیدھا سمجھایا اور بنواری لال نے بھی اپنا بیان دے دیا اور اقبالی ملزم بنائے گئے۔ بنواری لال نے کاکوری ڈکیتی میں اپنا شامل ہونا قبول کیا تھا۔ ادھر کلکتے میں دکھنیشور میں ایک مکان میں بم بنانے کا سامان، ایک بنا ہوا بم 7 ریوالور، پستول اور کچھ باغیانہ ادب پکڑا گیا۔ اس مکان میں شری راجندر ناتھ لاہری جو اس مقدمے میں فرار تھے گرفتار ہوئے۔

چندر ناتھ سانیال

اندر بھوشن نے گرفتار ہو جانے کے بعد اس کے ہیڈ ماسٹر کو ایک خط سی پی (سینٹرل پروونس یا وسطی صوبہ جو آج مدھیہ پردیش ہے۔) سے ملا جس کو اس نے ہارٹن صاحب کے پاس ویسا ہی بھیج دیا۔ اس خط کے ذریعہ ایک

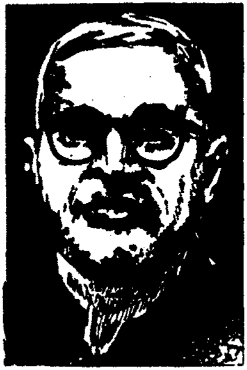
یوگیش چندر چٹرجی

شخص موہن لال کھتری کا چاندا میں پتہ چلا۔ وہاں سے پولیس نے تحقیق کرکے پونا میں شری رام کرشن کھتری کو گرفتار کرکے لکھنؤ بھیجا۔ بنارس میں بھیجے ہوئے پارسلوں کے تعلق سے جبلپور میں پرن ویش کمار چٹرجی کو گرفتار کرکے بھیجا گیا۔ کلکتہ میں شری شچیندر ناتھ سانیال جنھیں بنارس سازش میں عمر قید کالے پانی کی سزا ہوئی تھی اور جنھیں باکورا میں ''انقلابی'' پرچے بانٹنے کی وجہ سے دو سال کی سزا ہوئی تھی اس مقدمے میں لکھنؤ بھیجے گئے۔ شری یوگیش چندر چٹرجی بنگال آرڈی نینس کے قیدی ہزاری باغ جیل سے بھیجے گئے۔ آپ اکتوبر 1924ء میں کلکتے میں گرفتار ہوئے تھے۔ آپ کے پاس دو کاغذ پائے گئے جن میں سی پی کے سب ضلعوں کے نام تھے اور لکھا تھا کہ 22 ضلعوں میں کمیٹی کا کام ہو رہا ہے۔ یہ کاغذ اس سازش کے بارے میں سمجھے گئے۔ شری راجندر ناتھ لاہڑی دکھنیشور بم کیس میں دس سال کی کالا پانی کی سزا پانے کے بعد اس مقدمے میں لکھنؤ بھیجے گئے۔ اب تقریباً چھتیس افراد گرفتار ہوئے تھے۔ اٹھائیس پر مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ چلا تین افراد شری سچیندر ناتھ، شری چندر شیکھر آزاد اور شری اشفاق اللہ خاں فرار رہے۔ باقی سب مقدمہ عدالت میں آنے سے پہلے چھوڑ دیے گئے۔ اٹھائیس میں سے دو پر سے مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ اٹھا لیا گیا۔ دو کو سرکاری گواہ بنا کر انھیں معافی دے دی گئی۔ آخر میں مجسٹریٹ نے اکیس آدمیوں کو سیشن کے سپرد کیا۔ سیشن میں مقدمہ آنے پر شری دامودر سیٹھ بہت بیمار ہو گئے عدالت نہ آسکتے تھے اس لیے آخر میں بیس افراد رہ گئے۔ بیس میں سے دو افراد شری شچیندر ناتھ وشواس اور شری ہر گوبند سیشن کی عدالت میں رہا ہوئے۔ باقی اٹھارہ کو سزائیں ہوئیں۔

شری بنواری لال اقبالی ملزم ہو گئے۔ وہ ضلع رائے بریلی کانگریس کمیٹی کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے عدم تعاون

شچیندر ناتھ بخشی

تحریک میں چھ ماہ کی جیل بھی جھیلی تھی۔ اس پر بھی پولیس کی دھمکی سے جان خطرے میں پڑ گئی۔ آپ ہی ہماری سمیتی کے ایسے ممبر تھے جن پر سمیتی کا سب سے زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا۔ ہر ماہ آپ کو کافی روپیہ بھیجا جاتا تھا۔ وضع داری کی حفاظت کے لیے ہم لوگ حسب استطاعت بنواری لال کو ماہانہ چندہ دیا کرتے تھے۔ اپنے پیٹ کاٹ کر ان کو ماہانہ خرچ دیا گیا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے مددگاروں کی گردن پر چھری چلائی۔ زیادہ سے زیادہ دس سال کی سزا ہو جاتی۔ جس طرح کے ثبوت ان کے خلاف تھے ویسے ہی اسی طرح کے ثبوت دوسرے ملزموں کے خلاف تھے جنھیں دس دس سال کی سزا ہوئی۔ یہی نہیں پولیس کے بہکانے سے سیشن میں بیان دیتے وقت جو نئی باتیں ہوئی۔ یہیں نہیں پولیس کے بہکانے سے سیشن میں بیان دیتے وقت جو نئی باتیں انھوں نے جوڑیں ان میں میرے بارے میں کہا کہ رام پرشاد نکل ذاتیوں سے روپے سے اپنے خاندان کا گزارہ کرتا ہے۔ اس بات کو سن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور دل کو بڑا دھکا لگا کہ جن کی شرم پروری کے لیے جان کو خطرے میں ڈالا دنوں کو دن اور راتوں کو رات نہ سمجھا بری طرح سے مار کھائی والدین کا کچھ بھی خیال نہ کیا وہی اس طرح کے الزام لگائیں۔

چندر شیکھر آزاد

سمیتی کے ممبروں نے اس طرح کا برتاؤ کیا۔ باہر جو عام زندگی کے ساتھی

تھے انھوں نے بھی عجیب شکل اختیار کی۔ ایک ٹھاکر صاحب کے پاس کاکوری ڈکیتی کا نوٹ مل گیا تھا۔ وہ کہیں شہر میں پائے گئے تھے۔ جب گرفتاری ہوئی مجسٹریٹ کے یہاں ضمانت نامنظور ہوئی۔ جج صاحب نے چار ہزار روپئے کی ضمانت مانگی۔ کوئی ضمانت نہ ملتی تھی۔ ان کے ضعیف بھائی میرے پاس آئے۔ پیروں پر سر رکھ کر رونے لگے۔ میں نے ضمانت کرانے کی کوشش کی۔ میرے والدین عدالت جاکر کھلے طور پر پیروی کرنے کو منع کرتے رہے کہ پولیس خلاف ہے رپورٹ ہو جائے گی لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ کچہری جاکر کوشش کر کے ضمانت داخل کرائی۔ جیل سے انھیں خود جاکر چھڑایا۔ لیکن جب میں نے ان حضرت کا نام اس حادثے کو گواہی دینے کے لیے دیا تو پولیس نے انھیں ڈرایا اور انھوں نے پولیس کو تین بار لکھ کر دے دیا کہ ہم رام پرشاد بسمل کو جانتے بھی نہیں۔ ہندو مسلم فساد میں جن کے گھروں کی حفاظت کی تھی جن کے بال بچے میرے سہارے محلے میں بے خوفی سے رہتے تھے انھوں نے ہی میرے خلاف جھوٹی گواہیاں بنا کر بھیجیں۔ کچھ دوستوں کے بھروسے پر ان کا نام گواہی میں دے دیا کہ ضرور گواہی دیں گے۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر وہ جھک نہیں سکتے۔ لیکن وعدہ کر لینے پر بھی جب پولیس کا دباؤ پڑا تو وہ گواہی دینے سے انکار کر گئے۔ جن کو اپنا دل جگر اور دوست سمجھ کر ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار رہتا تھا جس طرح کی ضرورت ہوتی حسب استطاعت ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کبھی جیل آکر دیدار کرا جاتے پھانسی کی کوٹھری میں ہی آکر تسلی کی دو باتیں کر جاتے۔ ایک دو حضرات نے اتنی مہربانی اور ہمت کی کہ دس منٹ عدالت میں دور کھڑے ہو کر دیدار کرا گئے۔ یہ سب اس لیے کہ پولیس کی دہشت طاری تھی کہ گرفتار نہ کر لئے جائیں۔ اس پر بھی جس نے جو کیا میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں اور ان کا احسان مند ہوں۔

دو پھول چڑھاتے ہیں تربت بھی دبی جاتی
معشوق کے تھوڑے سے بھی احسان بہت ہیں

پرماتما سے یہی دعا ہے کہ سب خوش اور سکھی رہیں۔ میں نے تو سب باتوں کو جان کر ہی اس راہ میں قدم رکھا تھا۔ مقدمے سے پہلے دنیا کا کوئی تجربہ ہی نہ تھا۔ نہ کبھی جیل دیکھی تھی نہ کسی عدالت کا کوئی تجربہ تھا۔ جیل میں جاکر معلوم ہوا کہ کسی نئی دنیا

میں پہنچ گیا۔ مقدمے سے پہلے میں بھی نہیں جانتا تھا کہ کوئی تحریر شناسی سائنس بھی ہے۔ اس کا کوئی ماہر بھی ہوتا ہے جو تحریر کے اُسلوب کو دیکھ کر مصنف کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ تحریریں کس طرح ملائی جاتی ہیں ایک انسان کی تحریر میں کیا کیا فرق ہوتا ہے کیوں فرق ہوتا ہے تحریر شناسی کا ماہر دستخطوں کی تصدیق کر سکتا ہے اور مصنف کی حقیقی تحریر میں اور جعلی تحریر میں فرق کر سکتا ہے اس طرح کا کوئی بھی تجربہ اور علم نہ رکھتے ہوئے بھی ایک صوبے کی انقلابی کمیٹی کی پوری ذمے داری لے کر اسے چلا رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ انقلابی کاموں کی تعلیم دینے کے لیے کوئی اسکول تو ہے نہیں۔ یہی ہو سکتا تھا کہ پرانے تجربے کار انقلابیوں سے کچھ سیکھا جائے۔ نہ جانے کتنے افراد بنگال اور پنجاب کی سازشوں میں گرفتار ہوئے لیکن کسی نے بھی یہ کوشش نہ کی کہ ایک اس طرح کی کتاب لکھی جائے جس سے نو واردوں کو کچھ تجربے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

لوگوں کی اس بات کو جاننے کی بڑی بے چینی ہوگی کہ کیا پولیس کی قسمت ہی تھی جو سب بنا بنایا معاملہ ہاتھ آگیا۔ کیا پولیس والے غیب داں ہوتے ہیں؟ کیسے خفیہ باتوں کا پتہ چلا لیتے ہیں؟ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ملک کی بدقسمتی ہے! حکومت کی خوش نصیبی!! بنگال کی پولیس کے بارے میں تو زیادہ کہا نہیں جا سکتا کیوں کہ مجھے اس کا کوئی خاص تجربہ نہیں۔ اس صوبے کے خفیہ پولیس والے تو بڑے بھوندو ہوتے ہیں۔ جنھیں معمولی واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ عام پولیس سے خفیہ پولیس میں آتے ہیں۔ عام پولیس کی داروغائی کرتے ہیں مزے میں لمبی لمبی رشوت کھا کر بڑے بڑے پیٹ بڑھا آرام کرتے ہیں۔ ان کی بلا تکلیف اٹھائے۔ اگر کوئی ایک دو چالاک ہوئے بھی تو تھوڑے دن بڑے عہدے کے فراق میں کام دکھایا یا دوڑ دھوپ کی اور جب ترقی ہوگئی تو سب کام بند۔ اس صوبے میں کوئی باقاعدہ پولیس کا خفیہ محکمہ نہیں جس کو پابندی سے تعلیم دی جاتی ہو۔ پھر کام کرتے کرتے تجربہ ہو ہی جاتا ہے۔ مین پوری سازش اور اس سازش سے اس کا پورا پتہ لگ گیا کہ تھوڑی سی مہارت سے کام کرنے سے پولیس کے لیے پتہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ حقیقت میں ان کی کچھ قسمت ہی اچھی ہوتی ہے جب سے اس مقدمے کی جانچ شروع ہوئی پولیس نے اس صوبے کے مشتبہ انقلابیوں پر نظر ڈالی۔ اُن سے ملی۔ بات چیت کی۔ ایک دو کو کچھ دھمکیاں دیں۔ چور کی داڑھی میں تنکا والی کہاوت کے مطابق ایک صاحب سے پولیس کو سارا راز معلوم ہوگیا۔ ہم سب کے سب چکر میں تھے کہ اتنی جلدی پولیس نے

معاملے کا پتہ کیسے لگالیا۔ ان حضرت کی طرف تو دھیان بھی نہ جاتا تھا۔ لیکن گرفتاری کے وقت پولیس افسر اور مجھ سے جو باتیں ہوئیں ان میں پولیس افسر نے وہ سب باتیں مجھ سے کہیں جن کو میرے اور ان حضرت کے علاوہ کوئی بھی دوسرا نہیں جان سکتا تھا اور بھی بہت پکے اور سمجھ میں آنے والے ثبوت مل گئے کہ جن باتوں کو وہ حضرت ہی جان سکے تھے وہ ہی پولیس کو معلوم ہو سکا۔ جو باتیں آپ کو معلوم نہ تھیں وہ پولیس کو کسی طرح نہ معلوم ہو سکیں۔ ان باتوں سے یہ طے ہو گیا کہ یہ کام انھیں حضرت کا ہے اگر یہ حضرت پولیس کے ہاتھ نہ آتے اور راز نہ کھول دیتے تو پولیس سر پٹک کر رہ جاتی کچھ بھی پتہ نہ چلتا۔ بغیر پکے ثبوتوں کے خوفناک سے خوفناک فرد پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی کیوں کہ عوام میں تحریک پھیلنے سے بدنامی ہو جاتی ہے۔ سرکار پر جواب دہی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار آدمی پکڑے جاتے اور آخر کار انھیں بھی چھوڑنا پڑتا۔ لیکن جب پولیس کو پکا ثبوت ہاتھ آگیا اُس نے اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے تحریری ثبوت پولیس کو دے دیا۔ اس حالت میں پولیس گرفتاریاں نہ کرتی تو پھر کب کرتی؟ جو بھی ہوا پرماتما ان کا بھی بھلا کرے۔ اپنا تو زندگی بھر یہی اصول رہا۔

ستائے تجھ کو جو کوئی بے وفا بسمل
تو منھ سے کچھ نہ کہنا آہ! کر لینا
ہم شہیدان وفا کا دین و ایماں اور ہے
سجدے کرتے ہیں ہمیشہ پاؤں پر جلاد کے

میں نے اس مقدمے میں جو حصہ لیا یا جن کی زندگی کی ذمے داری میرے سر پر تھی ان میں سے زیادہ حصہ شری اشفاق اللہ خاں وارثی کا ہے۔ میں اپنے قلم سے ان کے لیے بھی آخری وقت میں دو لفظ لکھ دینا فرض سمجھتا ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں شاہی اعلان کے بعد شاہ جہاں پور آیا تھا تو تم سے اسکول میں ملاقات ہوئی تھی۔ تمھاری مجھ سے ملنے کی شدید دلی تمنا تھی۔ تم نے مجھ سے مین پوری سازش کے بارے میں کچھ بات چیت کرنی چاہی تھی۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ ایک اسکول کا مسلمان طالب علم مجھ سے اس طرح کی بات چیت کیوں کرتا ہے تمھاری باتوں کا جواب بے دلی سے دے دیا۔

اشفاق اللہ خاں

تمھیں اس وقت بڑا رنج ہوا تھا۔ تمھارے منھ سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ تم نے اپنے ارادے کو یونہی نہیں چھوڑ دیا اپنے عزم پر ڈٹے رہے۔ جس طرح ہو سکا کانگریس میں بات چیت کی۔ اپنے قریبی دوستوں کے ذریعے اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ تم بناوٹی آدمی نہیں، تمھارے دل میں ملک کی خدمت کرنے کی خواہش تھی۔ آخرکار تمھاری فتح ہوئی۔ تمھاری کوششوں نے میرے دل میں جگہ بنالی۔ تمھارے بڑے بھائی میرے اردو مڈل کے ہم جماعت اور دوست تھے یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو گئے تھے لیکن چھوٹا بھائی بن کر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تم مساوی حق کے طلب گار تھے۔ تم دوستوں کی فہرست میں اپنا شمار چاہتے تھے۔ وہی ہوا تم حقیقی دوست بن گئے۔ سب کو حیرت تھی کہ ایک کٹر آریہ سماجی اور مسلمان کا میل کیسا؟ میں مسلمانوں کی شدھی کرتا تھا۔ آریہ سماج مندر میں میری رہائش تھی لیکن تمھیں ان باتوں کی بالکل فکر نہ تھی۔ میرے کچھ ساتھی تمھیں مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن تم اپنے عہد میں پکے تھے۔ میرے پاس آریہ سماج مندر میں آتے جاتے تھے۔ ہندو مسلم فساد ہونے پر تمھارے محلے کے سب لوگ تمھیں کھلم کھلا گالیاں دیتے تھے کافر کے نام سے پکارتے تھے لیکن تم کبھی بھی ان کے خیالات سے متفق نہ ہوئے۔ ہمیشہ ہندو مسلم یک جہتی کے حامی رہے۔ تم ایک سچے مسلمان اور سچے وطن پرست تھے۔ تمھیں اگر زندگی میں کوئی فکر تھی تو یہی کہ مسلمانوں کو خدا عقل دیتا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کرتے۔ جب میں ہندی میں کوئی مضمون یا کتاب لکھتا تو تم ہمیشہ یہی مانگ کرتے کہ اردو میں کیوں نہیں لکھتے تاکہ مسلمان بھی پڑھ سکیں؟ تم نے حب الوطنی کے جذبات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہی ہندی کا اچھا مطالعہ کیا۔ اپنے گھر پر جب ماں اور بھائی سے بات کرتے تو تمھارے منھ سے

ہندی الفاظ نکلتے تھے جس سے سب کو بڑی حیرت ہوتی تھی۔

تمہارے اس طرح کے رجحان کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو شک ہوتا تھا کہ کہیں اسلام مذہب چھوڑ کر شدھی نہ کرالو۔ لیکن تمہارے دل میں تو کسی طرح کی کھوٹ نہ تھی پھر تم شدھی کس چیز کی کراتے؟ تمہاری اس طرح کی ترقی نے میرے دل پر پورا قبضہ جمالیا۔ اکثر دوستوں کا ذکر چھڑتا تھا۔ اکثر میں نے اور تم نے ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا ہے۔ میرے دل سے یہ خیال ہی جاتا رہا کہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق ہے۔ تم مجھ پر اندھا اعتماد اور گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ہاں! تم میرا نام لے کر نہیں پکار سکتے تھے۔ تم تو ہمیشہ "رام" کہا کرتے تھے۔ ایک بار جب دل دھڑکنے کا دورہ پڑا تھا تم بے ہوش تھے تمہارے منہ سے بار بار "رام" "ہائے رام" کے الفاظ نکل رہے تھے پاس کھڑے ہوئے رشتہ داروں کو حیرت تھی کہ رام رام کہتا ہے۔ کہتے تھے اللہ اللہ کہو لیکن تمہاری رام رام کی رٹ تھی۔ اسی وقت کسی دوست کو اندازہ ہوا جو رام کے فرق کو جانتے تھے۔ فوراً مجھے بلایا گیا۔ مجھ سے ملنے کے بعد تمہیں سکون ہوا تب سب لوگ رام کے راز سے واقف ہوئے۔ آخر میں اس پیار محبت اور دوستی کا کیا انجام ہوا؟ میرے خیالات کے رنگ میں تم بھی رنگ گئے! تم بھی کٹر انقلابی بن گئے۔ اب تو تمہاری دن رات یہی کوشش تھی کہ مسلم نوجوانوں میں بھی انقلابی جذبات پیدا ہوں۔ وہ بھی انقلابی تحریک میں تعاون کریں۔ جتنے تمہارے دوست احباب تھے ان سب پر تم نے اپنے خیالات کا اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ اکثر انقلابیوں کو بھی حیرت ہوتی کہ میں نے کیسے ایک مسلمان کو انقلابی جماعت کا سرگرم ممبر بنالیا۔ میرے دوست تم نے جو بھی کام کئے وہ قابل تعریف ہیں۔ تم نے کبھی بھی میرے احکامات کی حکم عدولی نہ کی۔ ایک فرماں بردار عقیدت مند کی طرح میرے احکامات کی پابندی میں لگے رہے۔ تمہارا دل بڑا وسیع تھا۔ تمہارے خیالات بہت بلند تھے۔

مجھے اگر اطمینان ہے تو یہی کہ تم نے دنیا میں میرا چہرہ روشن کردیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہوگیا کہ اشفاق اللہ نے انقلابی تحریک میں تعاون کیا۔ اپنے دوست احباب اور رشتے داروں کے سمجھانے پر بھی دھیان نہ دیا۔ گرفتار ہو جانے پر بھی اپنے نظریات پر ڈٹے رہے جیسے تم جسمانی طور پر طاقتور تھے ویسے ہی ذہنی طور پر بہادر اور روح سے بلند ثابت

ہوئے۔ جس کے نتیجے میں عدالت میں تمھیں میرا شریک کار (لیفٹیننٹ) قرار دیا گیا۔ ر جج نے مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت تمہارے گلے میں بے مالا (پھانسی کا پھندا) پہنادی۔ پیارے بھائی تمھیں یہ سمجھ کر تسلی ہوگی کہ جس نے اپنے والدین کی دولت کو خدمت وطن میں پیش کر کے انھیں بھکاری بنادیا جس نے اپنا تن من دھن سب مادرِ وطن کی خدمت میں پیش کر دیا اپنی آخری قربانی بھی دے دی اس نے اپنے عزیز دوست اشفاق کو بھی اسی مادرِ وطن کی بھینٹ چڑھادیا۔

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے

پھانسی کی کوٹھری

آخری وقت قریب ہے۔ دو پھانسی کی سزائیں سر پر جھول رہی ہیں پولیس کو عام زندگی میں اور اخبارات و رسائل میں جی بھر کے کوسا ہے۔ کھلی عدالت میں جج صاحب، خفیہ پولیس کے افسر، مجسٹریٹ، سرکاری وکیل اور حکومت کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ہر ایک کے دل میں میری باتیں کھٹک رہی ہیں۔ کوئی دوست آشنا یا رمددگار نہیں جس کا سہارا ہو۔ ایک پرم پتا پرماتما کی یاد ہے۔ گیتا پڑھتے ہوئے سکون ملتا ہے۔

جو کچھ کیا سو تم کیا میں کچھ کینہا ناہیں
جہاں کہیں کچھ میں کیا تم ہی تھے مجھ ماہیں
برہمنیادھائے کرمانڑیں سنگے تیکتوا کروتی یہ
لپیتے نہ سہ پاپے بھیو پدم پتر موامبھس

شری مد بھگوت گیتا/10/5

"جو ثمر کی خواہش کو چھوڑ کر اعمال کو دنیا میں پیش کر کے اعمال کرتا ہے وہ گناہ میں نہیں ڈوبتا۔ جس طرح پانی میں رہ کر کمل گیلا نہیں ہوتا۔ زندگی بھر جو کچھ کیا وطن کی بھلائی سمجھ کر کیا۔ اگر جسم کی حفاظت کی تو صرف اسی لیے کہ مضبوط جسم سے اچھی

طرح وطن عزیز کی خدمت کی جاسکے۔ بڑی کوششوں سے یہ مقدس دن حاصل ہوا۔ یوپی میں اس حقیر جسم کی ہی خوش قسمتی ہوگی 1857ء کے غدر کے حادثات کے بعد انقلابی تحریک کے متعلق اس صوبے کے باشندے کی یہ پہلی قربانی ہوگی جو مادر وطن کی قربان گاہ پر دی جائے گی۔

حکومت کی خواہش ہے کہ مجھے گھونٹ کر مارے۔ اسی وجہ سے اس گرمی کے موسم میں ساڑھے تین مہینے بعد اپیل کی تاریخ مقرر کی گئی۔ ساڑھے تین مہینے تک پھانسی کی کوٹھری میں رکھا گیا۔ یہ کوٹھری پرندے کے پنجرے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ گورکھ پور جیل کی پھانسی کی کوٹھری میدان میں بنی ہے۔ کسی طرح کا سایہ قریب نہیں ہے صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک سورج کی مہربانی سے اور چاروں طرف ریتیلی زمین ہونے کی وجہ سے آگ برستی ہے۔ نوفٹ لمبی اور نوفٹ چوڑی کوٹھری میں صرف چھ فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا دروازہ ہے۔ پیچھے کی طرف زمین سے آٹھ یا نوفٹ کی اونچائی پر ایک فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی کھڑکی ہے۔ اسی کوٹھری میں کھانا، نہانا اور حوائج ضروری سے فراغت اور سونا ہوتا ہے۔ مچھر اپنی میٹھی آواز رات بھر سناتے ہیں۔ بڑی کوشش سے رات میں تین یا چار گھنٹے نیند آتی ہے کسی کسی دن تین چار گھنٹے ہی سو کر گزارا کرنا پڑتا ہے مٹی کے برتنوں میں کھانا دیا جاتا ہے۔ اوڑھنے بچھانے کے لیے دو کمبل ملے ہیں۔ بڑے ایثار کی زندگی ہے۔ ریاضت کے سب وسائل جمع ہوگئے ہیں۔ ہر لمحہ تعلیم دے رہا ہے۔ آخری وقت کے لیے تیار ہو جاؤ پرماتما کا بھجن کرو۔

مجھے تو اس کوکوٹھری میں بڑا لطف آرہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کسی سادھو کی گپھا پر کچھ دن رہ کر یوگا کی مشق کی جائے۔ آخری وقت میں یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ اسی کوٹھری میں یہ اچھا موقعہ حاصل ہوگیا کہ اپنی چند آخری باتیں لکھ کر اہل وطن کو پیش کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میری زندگی کے مطالعے سے کسی روح کا بھلا ہو جائے۔ بڑی مشکل سے یہ مقدس موقع مجھے ملا ہے۔

محسوس ہو رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے
کھلنے لگے ہیں مجھ پر اسرار زندگی کے

بارِ الم اُٹھایا رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے
وفا پر دل کو صدقے جان کو نذر جفا کر دے
محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فدا کر دے

اب تو یہی خواہش ہے۔

بہے بحر فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہر شمشیر قاتل کی
سمجھ کر پھونکنا اس کو ذرا اے داغ ناکامی
بہت سے گھر بھی ہیں آباد اس اجڑے ہوئے دل سے

انجام

گیارہ برسوں تک اپنے حسب مقدور جی جان سے کوشش کرنے پر بھی ہم اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ کیا فائدہ ہوا؟ اس کے بارے میں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ ہم نے سود و زیاں اور جیت ہار کے خیال سے انقلابی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ فرض کی تکمیل میں ہم نے کتنی عقلمندی کا ثبوت دیا اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ہمارے کاموں کی اتنی ہی قیمت ہے کہ بہت سے نوجوانوں کی زندگی کو بے کیف بنا دیا اور اُن میں سے کچھ نے فضول ہی جان گنوا دی۔ کچھ دولت بھی خرچ کی۔ ہندو شاستروں کے مطابق کسی کی بھی وقت سے پہلے موت نہیں ہوتی جس کا جس طریقہ سے جو وقت ہوتا ہے اس کا اسی طریقے سے اسی وقت پر انتقال ہوتا ہے۔ صرف اسی طرح کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں ہندوستانی ہیضہ طاعون، چیچک وغیرہ مختلف مرضوں سے مر جاتے ہیں۔ کروڑوں قحط سالی میں کھانا ملے بغیر مر جاتے ہیں تو اس کی ذمے داری کس پر ہے؟ رہ گیا دولت کا خرچ سو اتنی دولت تو بھلے آدمیوں کے شادی

بیاہ میں خرچ ہو جاتی ہے۔ معزز افراد کے صرف عیش و آرام کی چیزوں کا ماہانہ خرچ اتنا ہوگا جتنا کہ ہم نے ایک سازش کرنے میں خرچ کیا۔ ہم لوگوں کو ڈاکو بتا کر پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں دی گئی ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وکیل اور ڈاکٹر ہم سے کہیں بڑے ڈاکو ہیں۔ وکیل ڈاکٹر دن دہاڑے بڑے بڑے تعلقداروں کی جائیدادیں لوٹ کر کھا گئے۔ وکیلوں کے چاٹے گئے اودھ کے تعلقداروں کو ڈھونڈے راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا اور وکیلوں کے اونچے محلات اُن پر کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں اسی طرح لکھنؤ میں ڈاکٹروں کے بھی اونچے اونچے محل بن گئے ہیں۔ لیکن ریاست میں دن کے ان ڈاکوؤں کی بڑی عزت ہے۔ ورنہ رات کے عام ڈاکوؤں اور دن کے ان ڈاکوؤں میں (وکیل اور ڈاکٹر) کوئی فرق نہیں دونوں اپنے اپنے مطلب کے لیے ذہانت کی مہارت سے عوام کی دولت لوٹ لیتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے ہم لوگوں کے کام کی بہت بڑی اہمیت ہے جس طرح بھی ہو یہ تو ماننا پڑے گا کہ گری ہوئی حالت میں بھی ہندوستانی نوجوانوں کے دل میں آزاد ہونے کے جذبات موجود ہیں۔ وہ آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتے ہیں اگر حالات موافق ہوتے تو یہی گنتی کے چند نوجوان اپنی کوششوں سے دنیا کو حیران کر دیتے۔ اس وقت ہندوستانیوں کو بھی فرانسیسیوں کی طرح کہنے کی سعادت نصیب ہوتی جو کہ اس قوم کے نوجوانوں نے فرانسیسی جمہوریت کو قائم کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔

"The monument so raised, may serve as a lesson to the oppressors and an instance to the oppressed."

یعنی آزادی کی جو یادگار قائم کی گئی ہے وہ ظالموں کے لیے درس عبرت کا کام کرے گی اور مظلوموں کے لیے مثال بنے گی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ہماری کوششوں کا ذکر کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ہندوستان کی سیاسی مذہبی اور سماجی کسی طرح کے حالات اس انقلابی تحریک کی حمایت میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستانیوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی ترقی کے بھی اہل نہیں ہیں۔ پھر سیاسی انقلاب کی بات کون کرے؟ سیاسی انقلاب کے لیے سب سے پہلے انقلابیوں کی تنظیم ایسی ہونی چاہیے کہ مختلف رکاوٹیں اور دشواریاں آجائیں تنظیم میں کسی طرح کی خامی نہ آئے۔ سب

کام ٹھیک ڈھنگ سے چلتے رہیں۔ کارکن اتنے قابل اور کافی تعداد میں ہونے چاہیے کہ ایک کی غیر موجودگی میں دوسری جگہ پُر کرنے کے لیے موجود رہے۔ ہندوستان میں کئی بار کتنی ہی سازشوں کا بھانڈا پھوٹ گیا اور سب کیا کرایا کام چوپٹ ہو گیا۔ جب انقلابی جماعتوں کی یہ حالت ہے تو پھر انقلاب کے لیے جدوجہد کون کرے؟ اہل وطن اتنے تعلیم یافتہ ہوں کہ وہ موجودہ سرکار کی پالیسیوں کو سمجھ کر اپنے نفع نقصان کو جاننے کے اہل ہو سکیں۔ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ سکیں کہ موجودہ حکومت کو ہٹانا ضروری ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن میں اتنی عقل بھی ہونی چاہیے کہ کس طریقے سے حکومت کو ہٹایا جاسکتا ہے انقلابی جماعت کیا ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ کیوں کرنا چاہتی ہے؟ ان ساری باتوں کو عوام کی زیادہ تعداد سمجھ سکے، انقلابیوں کے ساتھ عوام کی پوری ہمدردی ہو تب کہیں انقلابی جماعت کو ملک میں قدم جمانے کا مقام مل سکتا ہے۔ یہ تو انقلابی جماعت کے قیام کی ابتدائی باتیں ہیں۔ رہ گیا انقلاب تو وہ تو بہت دور کی بات ہے۔

انقلاب کا نام ہی بڑا خوفناک ہے۔ ہر طرح کا انقلاب مخالفوں کو خوف زدہ کر دیتا ہے۔ جہاں پر رات ہوتی ہے تو دن کی آمد پر رات کو نکلنے والے جانوروں کو افسوس ہوتا ہے ٹھنڈی آب و ہوا میں رہنے والے چرند پرند گرمی کے آنے پر اس ملک کو بھی چھوڑ دیتے ہیں پھر سیاسی انقلاب تو بہت خوفناک ہوتا ہے۔ انسان تجربات کا مجموعہ ہے۔ تجربات کے مطابق ہی اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جس طرح کوئی رکاوٹ موجود ہوتی ہے تو اُن کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر حکومت کے مددگار امیر اور زمیندار ہوتے ہیں یہ لوگ کبھی نہیں چاہتے کہ اُن کے عیش و آرام میں کسی طرح کا خلل پڑے۔ اس لیے یہ لوگ ہمیشہ انقلابی تحریکوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر کسی طرح دوسرے ملکوں کی مدد لے کر وقت پاکر انقلابی جماعت انقلاب کی کوشش میں کامیاب ہو جائے۔ ملک میں انقلاب ہو جائے تو اس وقت بھی قابل لیڈر نہ ہونے سے ملک میں بدامنی پھیل کر انسانی خون بہتا ہے اور ان کوششوں میں بہت سے قابل افراد، بہادر اور عالموں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی مثال 1857ء کا غدر ہے۔ اگر فرانس اور امریکہ کی طرح انقلاب کے ذریعے شہنشاہیت کو پلٹ کر جمہوریت قائم کر بھی لی جائے تو بڑے بڑے مالدار اپنی دولت اور طاقت سے ہر طرح کے حقوق دبا لیتے ہیں۔ ایگزیکیٹو کمیٹیوں

میں بڑے بڑے حقوق مالداروں ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ ملک کی حکومت میں مالدار ہی کے نظریات اعلیٰ مقام پاتے ہیں۔ دولت کی طاقت سے ملک کے اخبارات کارخانوں ملوں اور کانوں پر انھیں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ مجبوراً عوام کی بڑی تعداد ان کی حمایت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جو ذہن والے ہوتے ہیں وہ بھی موقع پا کر ذہنی طاقت کے سہارے عوام کی محنت کی کمائی سے حاصل کئے حقوق کو ہڑپ کر لیتے ہیں۔ خود غرضی کی وجہ سے وہ مزدوروں اور کسانوں کو ترقی کا موقعہ نہیں دیتے آخر میں یہ لوگ بھی سرمایہ داروں کے حامی ہو کر شہنشاہیت کے بجائے سرمایہ داروں کی حکومت قائم کرتے ہیں۔ انقلاب روس کے بعد یہی ہوا تھا۔ روس کے انقلابی اس بات کو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے شہنشاہیت کے خلاف جنگ کر کے اسے ختم کیا۔ اس کے بعد جیسے ہی سرمایہ داروں اور دانشوروں نے رکاوٹ پیدا کی اسی وقت اُن سے بھی جنگ کر کے انھوں نے حقیقی جمہوریت قائم کی۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ہندوستان میں انقلابی تحریک کے حامی کون کون سے وسائل موجود ہیں؟ پچھلے صفحات میں میں نے اپنے تجربات کا ذکر کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ کمیٹی کے ممبروں کا پیٹ بھرنے کے لیے کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ جی جان سے کوشش کرنے کے بعد عدم تعاون تحریک سے مایوس کچھ تھوڑے سے نوجوان یوپی میں ایسے مل سکے جو انقلابی تحریک کی حمایت کر کے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ ان چند افراد میں بھی دلی ہمدردی رکھنے والے، اپنی جان پر کھیل جانے والے، کتنے تھے اس کا کہنا ہی کیا ہے۔ کتنی بڑی بڑی اُمیدیں باندھ کر ان افراد کو انقلابی کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا اور اس حالت میں جب عدم تعاون تحریک والوں نے حکومت کی طرف سے نفرت پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کھلے طور سے شاہی بغاوت کی باتوں کی پوری تشہیر کی تھی۔ اس بار بھی بولشیویک امداد کی اُمیدیں دلا دلا کر اور انقلابیوں کے اعلیٰ نظریات اور قربانیوں کی مثالیں دے دے کر اُن کو ترغیب دلائی تھی۔ نوجوانوں کے دلوں میں انقلابیوں کے لیے بڑی عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ ان میں ہتھیار رکھنے کی فطری خواہش اور ریوالور اور پستول سے قدرتی رغبت انھیں انقلابی جماعت سے ہمدردی پیدا کر دیتی ہے۔

میں نے اپنی انقلابی زندگی میں ایک بھی نوجوان ایسا نہیں دیکھا جو ایک ریوالور یا پستول اپنے پاس رکھنے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔

جس وقت انھیں ریوالور کے دیدار ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ من پسند دیوتا کے دیدار ہو گئے آدمی زندگی کامیاب ہو گئی۔ اسی وقت سے وہ سمجھتے ہیں کہ انقلابی جماعت کے پاس اس طرح کے ہتھیار ہوں گے اسی لیے تو اتنی بڑی حکومت سے جنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ دولت کی بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ اب کیا ہے اب تو کمیٹی کے خرچ میں ملک گھومنے کا موقع ملے گا۔ بڑے بڑے ایثار پسند بزرگوں کے دیدار ہوں گے، حکومت کے خفیہ محکمہ کا بھی حال معلوم ہو سکے گا، حکومت کے ذریعے ضبط شدہ کتابیں کچھ تو پہلے ہی پڑھا دی جاتی ہیں باقی بچی ہوئی کی بھی اُمید ہوتی ہے کہ بڑا اعلیٰ ادب دیکھنے کو ملے گا جو ویسے کبھی حاصل نہ ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ انقلابیوں نے ملک کے راجا مہاراجاؤں کو تو اپنی حمایت میں کر ہی لیا ہو گا۔ اب کیا، تھوڑے ہی دن کی کسر ہے لوٹ دی سرکار کی حکومت۔ بم بنانا سیکھ ہی جائیں گے۔ آب حیات حاصل ہو جائے گا۔ لیکن جیسے ہی ایک نوجوان انقلابی جماعت کا ممبر بن کر سچے دل سے کمیٹی کے کاموں میں حصہ لیتا ہے تھوڑے دن ہی میں اُسے خاص ممبر ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ سرگرم ممبر بنتا ہے۔ اسے انجمن کا کچھ اصلی حال معلوم ہوتا ہے اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کتنے خطرناک کام میں اس نے ہاتھ ڈالا ہے۔ پھر تو وہی حالت ہو جاتی ہے جو ''نکلا پنتھ'' کے ممبروں کی تھی۔

جب چاروں طرف سے ناکامی اور بد اعتمادی کے واقعات دکھائی دیتے ہیں تب یہی خیال ہوتا ہے کہ اس طرح کی مشکل راہ میں یہ نتائج تو ہوتے ہی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے انقلابیوں کی راہ میں بھی ایسی ہی رکاوٹیں آئی ہوں گی۔ بہادر وہی کہلاتا ہے جو اپنے مقصد کو نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح کی باتوں سے دل کو پر سکون کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے عوام کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقہ بھی یہ بات نہیں جانتا کہ انقلابی جماعت کیا چیز ہے پھر اُن سے ہمدردی کون رکھے؟ بغیر اہل وطن کی ہمدردی کے یا بغیر عوام کی آواز کے حکومت بھی کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ دو چار پڑھے لکھے ایک دو انگریزی اخبار میں دبے لفظوں میں اگر دو ایک مضمون لکھ دیں تو وہ صدائے صحرا جیسے بے سود ثابت ہوتے ہیں۔ اُن کی آواز فضول میں آسمانوں میں گم ہو جاتی ہے۔ تمام باتوں کے مدِ نظر اب تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اچھا ہوا جو میں گرفتار ہو گیا اور کسی طرح کے عیش و آرام کی مجھے سہولیات تھیں۔ گرفتاری سے قبل ہی مجھے اپنی گرفتاری کا پورا پتہ چل گیا تھا۔ گرفتاری سے قبل بھی اگر خواہش ہوتی تو پولیس

والوں کو میری ہوا بھی نہ لگتی لیکن مجھے تو اپنی طاقت کا امتحان لینا تھا۔ گرفتاری کے بعد سڑک پر آدھے گھنٹہ تک بغیر کسی ہتھکڑی کے گھومتا رہا۔ پولیس والے سکون سے بیٹھے ہوئے تھے جب پولیس کوتوالی میں پہنچا، دوپہر کے وقت پولیس کوتوالی کے دفتر میں بھی بغیر کسی بندش کے کھلا بیٹھا رہا تھا۔ صرف ایک سپاہی نگرانی کے لیے پاس بیٹھا ہوا تھا جو رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سب پولیس افسر بھی رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ گرفتاری میں لگے رہے تھے۔ سب آرام کرنے چلے گئے تھے۔ نگرانی کرنے والا سپاہی بھی سخت نیند میں سو گیا۔ دفتر میں صرف ایک منشی لکھا پڑھی کر رہے تھے۔ وہ بھی شری روشن سنگھ ملزم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اگر میں چاہتا تو دھیرے سے اٹھ کر چل دیتا۔ لیکن میں نے سوچا کہ منشی جی برے پھنسیں گے۔ میں نے منشی جی کو بلا کر کہا اگر مستقبل کی مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہو تو میں چلا جاؤں۔ وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ پیروں پر گر گئے کہ گرفتار ہو جاؤں گا بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ مجھے رحم آ گیا۔ ایک گھنٹے بعد شری اشفاق اللہ خاں کے گھر کی تلاشی لے کر پولیس والے واپس آئے۔ شری اشفاق اللہ خاں کے بھائی کے کارتوسی بندوق اور کارتوسوں کی بھری ہوئی پیٹی لا کر انھیں منشی جی کے پاس رکھ دی گئی اور میں پاس ہی کرسی پر کھلا بیٹھا رہا تھا۔ صرف ایک سپاہی خالی ہاتھ پاس میں کھڑا تھا۔ خواہش ہوئی کہ بندوق اٹھا کر کارتوسوں کی پیٹی گلے میں ڈال لوں پھر کون سامنے آتا ہے۔ لیکن پھر سوچا کہ منشی جی پر الزام آئے گا غداری کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس وقت خفیہ پولیس کے ڈپٹی سپرینٹنڈنٹ سامنے چھت پر آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ میرے ایک طرف کارتوس اور بندوق پڑی ہے دوسری طرف شری پریم کشن کا ماؤزر پستول اور کارتوس رکھے ہیں کیوں کہ سب چیزیں منشی جی کے پاس آ کر جمع ہوتی تھیں اور میں بغیر کسی بندش کے درمیان میں کھلا ہوا بیٹھا ہوں۔ ڈی۔ سو۔ کو فوراً شک ہوا انھوں نے بندوق اور پستول کو وہاں سے ہٹا کر مال خانے میں بند کروایا۔ طے کیا کہ اب بھاگ چلوں۔ پاخانے کے بہانے سے باہر نکلا۔ ایک سپاہی کوتوالی سے باہر دوسرے مقام پر فراغت کے لیے لے گیا۔ دوسرے سپاہیوں نے اس سے بہت کچھ کہا کہ رسی ڈال لو۔ اس نے کہا مجھے یقین ہے یہ بھاگیں گے نہیں۔ پاخانہ بالکل الگ تھا۔ مجھے پاخانے بھیج کر وہ سپاہی کھڑا ہو کر سامنے کشتی دیکھنے لگا۔ میں نے دیوار پر پیر رکھا اور چڑھ کر دیکھا کہ سپاہی حضرت کشتی دیکھنے میں مست ہیں۔ ہاتھ بڑھاتے ہی دیوار کے اوپر اور ایک لمحہ میں باہر ہو جاتا پھر مجھے

کون پاتا؟ لیکن فوراً خیال آیا کہ جس سپاہی نے بھروسہ کرکے تمھیں اتنی آزادی دی اس کے ساتھ دھوکا کرکے بھاگ کر اُسے جیل میں ڈالو گے؟ کیا یہ مناسب ہوگا؟ اس کی اولاد کیا کہے گی؟ اس خیال نے دل پر ایک ٹھوکر لگائی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری، دیوار سے اُتر کر باہر آیا۔ سپاہی جی کو ساتھ لیا اور کوتوالی کی حوالات میں آکر بند ہوگیا۔

لکھنؤ جیل میں کاکوری کے ملزموں کو بڑی آزادی تھی رائے صاحب پنڈت چمپالال جیلر کی مہربانی سے ہمیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ہم جیل میں ہیں یا کسی رشتے دار کے یہاں مہمانی میں ہیں۔ جیسے والدین سے چھوٹے چھوٹے لڑکے بات بات پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ پنڈت چمپالال جی کا ایسا دل تھا کہ وہ ہم لوگوں سے اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبت کرتے تھے ہم میں سے کسی کو ذرا سی تکلیف ہوتی تھی تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ ہماری ذرا سی تکلیف کو بھی وہ خود نہ دیکھ سکتے تھے۔ اور ہم لوگ ہی کیوں ان کی جیل میں کسی قیدی یا سپاہی، جمعدار یا منشی کسی کو بھی کوئی تکلیف نہیں۔ سب بڑے خوش رہتے تھے۔ اس کے علاوہ میرا روزمرہ کا معمول اور اصولوں کی پابندی دیکھ کر پہرے کے سپاہی اپنے استاد سے بھی زیادہ میری عزت کرتے تھے۔ میں پابندی سے سردی گرمی اور برسات میں صبح سویرے تین بجے سے اُٹھ کر پوجا سے فارغ ہو کر روز ہون بھی کرتا تھا۔ اگر کسی کے بال بچے کو تکلیف ہوتی تھی تو وہ ہون کی بھبھوت (راکھ) لے جاتا۔ کوئی تعویذ مانگتا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق انھیں آرام بھی ہوتا تھا اور اُن کی عقیدت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ نتیجے میں جیل سے نکلنے کا پورا انتظام کرلیا جس وقت چاہتا چپ چاپ نکل جاتا۔ ایک رات کو تیار ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیرک کے نمبردار تو میرے سہارے پہرہ دیتے تھے جب جی میں آتا سوتے جب خواہش ہوتی بیٹھ جاتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر سپاہی یا جمعدار سپرینٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے تو میں بچالوں گا۔ سپاہی تو کوئی فکر ہی نہ کرتے تھے۔ چاروں طرف سکون تھا۔ صرف اتنی کوشش کرنی تھی کہ لوہے کی کٹی ہوئی سلاخوں کو اٹھا کر باہر ہو جاؤں۔ چار مہینے پہلے سے لوہے کی سلاخیں کاٹ لی تھیں۔ کاٹ کر وہ ایسے طریقے سے جمادی تھیں کہ سلاخیں دھوئی گئیں، رنگت لگوائی گئیں۔ تیسرے دن صاف کی جاتیں، آٹھویں دن ہتھوڑی سے ٹھونکی جاتیں اور جیل کے عہدے دار ہر روز شام کے وقت گھوم پھر کر سب طرف نگاہ ڈال جاتے تھے لیکن کسی کو کوئی پتہ نہ چلا۔ جیسے ہی جیل سے فرار ہونے کے خیال سے اٹھا تھا۔ خیال آیا کہ جن

پنڈت چمپالال کی مہربانی سے ہر طرح کے آرام کی جیل میں آزادی ملی ان کے بوڑھاپے میں جب کہ تھوڑا ہی سا وقت اُن کے پینشن کے لیے باقی ہے کیا اُن ہی کے ساتھ بدعہدی کر کے بھاگ نکلوں؟ سوچا زندگی بھر کسی سے بدعہدی نہ کی۔ اب بھی بدعہدی نہ کروں گا۔ اس وقت مجھے بخوبی معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہوگی لیکن مندرجہ بالا بات سوچ کر فرار ملتوی کر دیا۔ یہ ساری باتیں بھلے مبالغہ ہی محسوس ہوں لیکن یہ حرف بہ حرف سچ ہیں۔ سب کے ثبوت موجود ہیں۔

میں اس وقت اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم لوگوں نے پوری کوشش سے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی سعی کی ہوتی تو ہماری یہ کوشش انقلابی تحریک سے کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی جس کا نتیجہ دیرپا ہوتا۔ زیادہ اچھا ہوگا اگر ہندوستان کی آنے والی نسل اور نوجوان انقلابی تنظیمیں بنانے کے بجائے عوام کے جذبات کا رخ وطن کی خدمت کی طرف موڑنے کی کوشش کریں اور مزدوروں اور کسانوں کو منظم کر کے ان کو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مظالم سے بچائیں۔ متوسط طبقہ کے افراد کسی نہ کسی طرح انہی تینوں پر منحصر ہیں۔ کوئی تو نوکر پیشہ ہے اور جو کوئی کاروبار بھی کرتے ہیں انھیں بھی ان کا ہی منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ رہ گئے مزدور اور کسان تو انھیں پیٹ بھرنے کے کاموں ہی سے وقت نہیں ملتا جو مذہب، سماج اور سیاست کی طرف توجہ دے سکیں۔ شراب نوشی کی وجہ سے ان کا کردار بھی ٹھیک نہیں رہ پاتا۔ بدچلنی، کثرت اولاد، کم عمری میں موت اور طرح طرح کے مرضوں سے زندگی بھر وہ نجات نہیں پا سکتے۔ کسانوں میں صنعت و حرفت کا تو نام بھی نہیں ہے اگر ایک کسان کو زمینداروں کی مزدوری کرنے یا ہل چلانے کی نوکری پر گاؤں میں آج سے بیس سال پہلے دو آنے روز یا چار روپے ماہانہ ملتے تھے تو آج بھی وہی تنخواہ بندھی چلی آرہی ہے بیس سال پہلے وہ اکیلا تھا اب اس کی بیوی اور چار اولادیں بھی ہیں۔ لیکن ان تنخواہ میں نے سے گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اُسے اسی پر اطمینان کرنا پڑتا ہے۔ تمام دن جیٹھ کی دھوپ اور لو میں گنے کے کھیت میں پانی دیتے دیتے اس کو رتوندھی آنے لگتی ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کے بدلے میں آدھا سیر سڑے ہوئے شیرے کا شربت یا آدھا سیر چنا یا چھ پیسے روز مزدوری ملتی ہے۔ جس میں اُسے اپنے خاندان کا پیٹ پالنا پڑتا ہے۔

جس کے دل میں مادرِ ہند کی خدمت کے جذبات ہوں یا جو مادرِ وطن کو آزاد کرانے کی خواہش رکھتا ہو اس کے لیے مناسب

ہے کہ دیہی تنظیم کر کے کسانوں کی حالت بہتر بنا کر ان کے دلوں سے مقدر پر انحصار کرنے کے رجحان کو ہٹا کر اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کی تعلیم دیں۔ کل کارخانے، ریلوے، جہاز اور کانوں میں جہاں کہیں مزدور ہوں۔ ان کی حالت کو سدھارنے کے لیے مزدوروں کی تنظیمیں قائم کی جائیں تاکہ اُن کو اپنی حالت کا علم ہو سکے اور کارخانوں کے مالک من چاہے ظلم نہ کر سکیں اور اچھوتوں کو، جن کی تعداد اس ملک میں تقریباً چھ کروڑ ہے، کافی تعلیم حاصل کرنے کا انتظام ہو اور اُن کو سماجی حقوق میں مساوات حاصل ہو۔ جس ملک میں چھ کروڑ انسان اچھوت سمجھے جاتے ہوں اس ملک کے لوگوں کو آزاد ہونے کا حق ہی کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی حالت میں بھی اصلاح کی جائے کہ وہ خود کو انسانی ذات کا حصہ سمجھنے لگیں۔ وہ پیر کی جوتی اور گھر کی گڑیا نہ سمجھی جائے۔ اتنے کام ہو جانے کے بعد جب ہندوستان کی آبادی کا زیادہ تر حصہ تعلیم یافتہ ہو جائے گا وہ اپنی اچھائی برائی سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے اس وقت ہر تحریک جس کی تعلیم یافتہ عوام حمایت کرے گی یقیناً کامیاب ہوگی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اُسے دبا نہ سکے گی۔ روس میں جب تک کسان منظم نہیں ہوا، روس کی حکومت کی طرف سے وطن پرستوں پر من چاہے ظلم ہوتے رہے۔ جس وقت "ینتھورانن" نے دیہی تنظیم اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ جگہ جگہ کسانوں کی اصلاح کے لئے تنظیمیں قائم کیں۔ روس کے نوجوان لڑکے لڑکیوں نے پورے ملک میں گھوم پھر کر زار شاہی کے خلاف تشہیر کی۔ اُسی وقت سے کسانوں کو اپنی حقیقی حالت کا اندازہ ہونے لگا اور وہ لوگ اپنے دوست دشمن کو اچھی طرح سمجھنے لگے۔ اُسی وقت سے زار شاہی کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ مزدوروں کی تنظیمیں بھی قائم ہوئیں۔ روس میں ہڑتالوں کا آغاز ہوا اُسی وقت سے عوام کے رجحان کو دیکھ کر ظالموں کی آنکھیں کھل گئیں۔

ہندوستان میں سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ اس ملک کے نوجوانوں میں شہری زندگی گزارنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ نوجوان طبقہ سفید پوشی، پکی سڑکوں پر چلنے، کھٹا میٹھا اور چٹ پٹا کھانا کھانے، غیر ملکی چیزوں سے سجے سجائے بازاروں میں گھومنے، میز کرسی پر بیٹھنے اور عیش و آرام کے عادی ہو چکے ہیں۔ دیہی زندگی کو وہ بے کیف اور خشک سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دیہات میں نیم مہذب یا جنگلی لوگ رہتے ہیں۔ اگر کبھی کسی انگریزی اسکول یا کالج میں پڑھنے والا طالب علم کسی کام سے اپنے کسی

رشتے دار کے یہاں گاؤں میں پہنچ جاتا ہے تو اُسے وہاں دو چار دن کاٹنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ یا تو کوئی ناول ساتھ لے جاتا ہے جسے تنہا بیٹھے پڑھتا رہتا ہے یا پڑے پڑے سویا کرتا ہے۔ کسی گاؤں والے سے بات چیت کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے زمیندار یا رئیس جو اپنے لڑکے کو انگریزی پڑھاتے ہیں ان کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو ان کے لڑکے کوئی سرکاری نوکری حاصل کر سکیں۔ دیہاتی بچے جس وقت شہر میں پہنچ کر شہری شان کو دیکھتے ہیں، اتنی بُری طرح سے اُن پر فیشن کا بھوت سوار ہوتا ہے کہ ان کے مقابلے میں کوئی بھی فیشن نہیں کر سکتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُن کے کردار پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور وہ اسکول کے گندے لڑکوں کے ہاتھوں میں پڑ کر بڑی بُری بُری برائیوں کا گھر بن جاتے ہیں۔ اُن سے زندگی بھر اپنی ہی اصلاح نہیں ہو پاتی۔ پھر وہ گاؤں کے لوگوں کی اصلاح کیا خاک کر سکیں گے۔

عدم تعاون تحریک میں کارکنوں کی اتنی زیادہ تعداد ہونے پر بھی سب کے سب شہر کے پلیٹ فارموں پر لیکچر بازی کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایسے بہت تھوڑے کارکن تھے جنھوں نے گاؤں میں کچھ کام کیا۔ اُن میں زیادہ تر ایسے تھے جو صرف ہلڑ بازی کو ہی وطن کی بھلائی سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک میں تھوڑا سا جمود آتے ہی تمام کام بکھر گیا۔ اسی وجہ سے مہامنا دیش بندھو چترنجن داس نے آخری وقت میں گاؤں کی تنظیم ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ میرے خیال سے گاؤں کی تنظیم کا سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوجوانوں میں شہری زندگی چھوڑ کر دیہی زندگی کے لیے محبت پیدا ہو جائے۔ جو نوجوان مڈل، انٹرنس، ایم اے، بی اے پاس کرنے میں ہزاروں روپیہ برباد کر کے دس، پندرہ، بیس یا تیس روپئے کی نوکری کے لیے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں انہیں نوکری کا سہارا چھوڑ کر کوئی صنعت یا کام دھندے جیسے بڑھئی گیری، آہن گری، درزی کا کام، دھوبی کا کام، جوتے بنانا، کپڑے بننا، راج گیری وغیرہ سیکھ لینا چاہیے۔ اگر کچھ صاف ستھرا رہنا ہو تو وید ک سیکھ لیں۔ کسی بڑے گاؤں یا قصبے میں جا کر کام شروع کریں۔ مندرجہ بالا کاموں میں سے کوئی بھی کام ایسا نہیں جس میں چار یا پانچ گھنٹے محنت کر کے تیس روپئے ماہانہ کی آمدنی نہ ہو سکے۔ گاؤں میں تیس روپئے ماہوار شہر کے ساٹھ روپئے سے زیادہ ہیں کیونکہ گاؤں میں لکڑی اور کپڑوں کی قیمت بہت کم ہوتی ہے اور اگر کسی زمیندار کی مہربانی ہو گئی اور ایک سوکھا ہوا درخت کٹوا دیا تو چھ ماہ کے لیے ایندھن کی چھٹی ہو

گئی۔ خالص گھی، دودھ سستے داموں میں مل جاتا ہے اور خود ایک یا دو گائے یا بھینس پال لی تب تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام ہی مل گئے۔ چارہ سستا ملتا ہے۔ گھی دودھ بال بچے کھاتے ہیں اوپلوں کا ایندھن ہو تا ہے اور اگر کسی کی مہربانی ہو گئی تو فصل پر ایک یا دو بھنس کی گاڑی بغیر قیمت ہی مل جاتی ہے۔ زیادہ تر کام کرنے والوں کو گاؤں میں چار انکڑی کے لیے پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔

ہزاروں اچھے اچھے گاؤں ہیں جن میں وید، درزی، دھوبی سکونت ہی اختیار نہیں کرتے۔ اُن گاؤوں کے لوگوں کو دس بیس کوس دوڑ دوڑنا پڑتا ہے۔ جس سے وہ اتنے پریشان ہوتے ہیں جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر بروقت کپڑے نہیں ملتے۔ مہنگی دوائیاں بڑے بڑے قصبے میں نہیں ملتیں۔ اگر معمولی عطار بن کر ہی قصبے میں بیٹھ جائیں اور دو چار کتابیں دیکھ کر دوائیاں دیا کریں تو بھی تیس چالیس روپیہ ماہوار کی آمدنی تو کہیں نہیں گئی۔ اس طرح پیٹ بھرنے اور خاندان پالنے کا انتظام ہو جاتا ہے۔ گاؤں کی زیادہ آبادی سے تعارف ہو جاتا ہے۔ تعارف ہی نہیں جس کا وقت ضرورت کام نکل گیا وہ شکر گزار بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں ضرورت پڑنے پر وہ فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ گاؤں میں کون ایسا انسان ہے جس کا لوہار، بڑھئی، دھوبی، درزی، کمہار یا وید سے کام نہیں پڑتا؟ میرا اچھی طرح تجربہ ہے کہ ان لوگوں کے گاؤں کے اچھے سے اچھے لوگ خوشامد کرتے رہتے ہیں۔

روزانہ کام پڑتے رہنے سے اور تعلق ہونے سے اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے اور گاؤں کے لوگوں کو تھوڑی سی نصیحت دے کر اُن کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جائے تو بڑی جلدی کام بن جائے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ لوگ وطن پرست اور کھادی پوش بن جائیں۔ اگر اُن میں ایک دو تعلیم یافتہ ہوں تو انھیں ترغیب دلا کر اُن کے پاس ایک اخبار منگانے کا انتظام کر دیا جائے۔ تاکہ ملک کی حالت کا بھی انھیں کچھ علم ہوتا رہے۔ اسی طرح آسان آسان کتابوں کی کہانیاں سنا کر اُن میں سے بُری رسموں کو چھڑایا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی خود رامائن یا بھاگوت کی کتھا بھی سنایا کریں۔ اگر پابندی سے بھاگوت کی کتھا کہیں تو کافی روپیہ بھی چڑھاوے میں آ سکتا ہے جس سے ایک لائبریری قائم کر دیں۔ کتھا کہنے کے موقع پر بیچ بیچ میں چاہے جتنا سیاسی باتوں کو شامل کر دیں کوئی خفیہ پولیس کا رپورٹر بیٹھا جو رپورٹ کرلے۔ ویسے اگر کوئی کھادی پوش گاؤں میں تقریر کرنا چاہے تو فوراً

زمیندار پولیس میں خبر کردے اور اگر وید، ماسٹر اور کتھا کہنے والا پنڈت کوئی بات کہے تو سب چپ چاپ سن کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اسی طرح مختلف سہولیات مل سکتی ہیں۔ شبینہ اسکول کھول کر غریب اور اچھوت ذاتوں کے بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں لیبر یونین قائم کرنے میں شہری زندگی تو گزر سکتی ہے لیکن اس کے لیے اُن کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا پڑے گا۔ جس وقت وہ اپنے اپنے کام سے چھٹی پاکر آرام کرتے ہیں اس وقت ان کے ساتھ بات چیت کرکے دلچسپ اُپدیشوں کے ذریعے ان کو ان کی حالت کے بارے میں بتانے کا موقع مل سکتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ڈکشن و ناول کے ذریعے کسی اُپدیش دینے کے طریقے سے جیسے لالٹین کے ذریعے تصویریں دکھا کر یا کسی دوسرے طریقے سے ان کو ایک مقام پر جمع کیا جائے اور شبینہ اسکول کھول کر اُن کو اور ان کے بچوں کو تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا جائے۔ جتنے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فضول میں دولت برباد کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انگریزی کی دسویں درجے کی قابلیت حاصل کرکے کسی صنعت و حرفت کو سیکھنے کی کوشش کریں اور اس صنعت و حرفت ہی کے ذریعے اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔

جو مالدار افراد ملک کی خدمت کی خاطر بڑے بڑے اسکول اور کالج کھولتے ہیں اُن کو چاہیے کہ تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ تکنیکی ادارے بھی قائم کریں۔ ان درس گاہوں کے طلبہ کو نیتاگری کی چمک دمک سے بچایا جائے۔ طلباء کی زندگی سادہ ہو اور خیالات بلند ہوں۔ ان تعلیمی اداروں میں ایک تبلیغ کا محکمہ بھی ہو جہاں طلباء تبلیغ کرنے کا طریقہ سیکھ سکیں۔ جن طلباء کے دلوں میں خدمتِ وطن کا جذبہ ہو ان کو تکالیف برداشت کرنے کی عادت ڈال کر منظم ہو کر ایسا کام کرنا چاہیے جس کے دیرپا نتائج ہوں۔ کیتھورائن (روس کا انقلاب رہنما) نے اسی طرح کام کیا تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد کیتھورائن کے پیرو گاؤوں میں جاکر پڑے سیتے یا جوتے بناتے اور رات کے وقت کسانوں کے سامنے تقریریں کرتے تھے۔ جس وقت کیتھورائن کی سوانح حیات (The Grand mother of Russian Revolution) کا انگریزی زبان میں مطالعہ کیا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میں نے فوراً اس کی سوانح حیات "کیتھورائن" نام سے ہندی میں شائع کرائی۔ میں اسی طرح کام کرنا چاہتا تھا، لیکن درمیان ہی میں

انقلابی تحریک میں پھنس گیا۔ میرا تو اب یہ ارادہ ہو گیا ہے کہ ابھی پچاس سال تک انقلابی جماعت کو ہندوستان میں کامیابی نہیں مل سکتی کیوں کہ یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہیں۔ اس لیے انقلابی جماعت کو منظم کر کے فضول میں نوجوانوں کی زندگی برباد کرنا اور طاقت کا غلط استعمال کرنا وغیرہ بڑی فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس میں فائدہ کے بجائے نقصان کے امکانات زیادہ ہیں۔ نوجوانوں کو میرا آخری پیغام یہی ہے کہ وہ ریوالور یا پستول کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش کو چھوڑ کر سچے وطن پرست بنیں۔ مکمل آزادی ان کا نصب العین ہو اور وہ حقیقی کمیونسٹ بننے کی کوشش کرتے رہیں۔ ثمر کی خواہش چھوڑ کر سچے خلوص سے کام کریں پرماتما ہمیشہ ان کا بھلا کرے گا۔

یدی دیش ہت مرنا پڑے مجھ کو سہسروں بار بھی
تو بھی نہ اس کشٹ کو نج دھیان میں لاؤں کبھی
ہے ایش بھارت ورش میں شت بار میرا جنم ہو
کارن سدا ہی مرتیو کا دیش اوپکارک کرم ہو

(ترجمہ: اگر مادر وطن کی خاطر مجھے ہزاروں بار بھی مرنا پڑے تو بھی اس تکلیف پر میں کبھی دھیان نہ دوں گا۔ اے خدا! اگر ہندوستان میں مجھے بار بار جنم لینا پڑے اور میرے مرنے کا ہر بار وطن کی بھلائی کے کاموں کا ہی سبب بنے۔)

آخری وقت کی باتیں

آج 16 دسمبر 1927ء کو مندرجہ ذیل سطور کا ذکر کر رہا ہوں جب کہ 19 دسمبر 1927ء کو ساڑھے چھے بجے صبح سویرے اس جسم کو پھانسی پر لٹکا دینے کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ یہ نظارہ دیکھنا ہوگا۔ یہ سب اس خدا کے کرشمے ہیں۔ تمام کام اسی کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ سب اس پرماتما کے اصولوں کا نتیجہ ہے کہ کس طرح کس کی موت آتی ہے۔ موت کے یہ انداز محض دکھاوے ہیں۔ جب تک کرم پورا نہیں ہو جاتا روح کو جنم اور مرنے کے بندھن میں پڑنا ہی پڑتا ہے۔ یہ شاستروں نے طے کیا ہے۔ اگرچہ یہ بات وہ قادر مطلق ہی جانتا ہے کہ کن افعال کے نتائج میں کون سا جسم اس روح کو حاصل کرنا ہوگا لیکن اپنے لیے

یہ میرا یقین محکم ہے کہ میں اچھا جسم لے کر نئی طاقتوں کے ساتھ بہت جلد دوبارہ کسی قریبی رشتے دار یا قریبی دوست کے گھر میں جنم لوں گا کیوں کہ میرا ہر جنم میں یہی مقصد رہے گا کہ بنی نوع انسان کو تمام قدرتی وسائل پر مساوی حق حاصل ہو۔ موجودہ دور میں ہندوستان کی حالت بڑی قابل رحم ہے اس لیے لگاتار کئی جنم اس ملک میں لیتا ہوں گے اور جب تک اہل ہند مکمل طور پر آزادانہ ہو جائیں۔ پرماتما سے میری یہی دعا ہو گی کہ وہ مجھے اسی ملک میں پیدا کرے تاکہ اس کی مقدس آواز 'ویدوں کی آواز' کو انسانوں کے کانوں تک پہنچاتا رہوں۔ ممکن ہے کہ میں راہ کے تعین میں غلطی کر جاؤں لیکن اس میں میری کوئی خاص غلطی نہیں کیوں کہ میں بھی تو کم علم جاندار ہوں۔ ہمیں حالات کے مطابق ہی سب کام کرنے پڑیں اور کرنے ہوں گے۔ پرماتما اگلے جنم میں اچھی عقل عطا کرے تاکہ میں جس راہ کی تقلید کروں وہ خامیوں سے پاک ہو۔

اب میں ان باتوں کا ذکر بھی کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو کاکوری سازش کے ملزموں کے بارے میں سیشن جج کے فیصلہ سنانے کے بعد واقع ہوئے۔ 6 اپریل 1927ء کو سیشن جج نے فیصلہ سنایا تھا۔ 18 جولائی 1927ء کو اودھ چیف کورٹ میں اپیل ہوئی۔ اس میں سزائیں کچھ بڑھیں اور ایک آدھ میں کمی بھی ہوئی۔ اپیل ہونے کی تاریخ سے پہلے میں نے یوپی کے گورنر کی خدمت میں ایک (میموریل) درخواست بھیجی تھی جس میں حلف لیا تھا کہ اب مستقبل میں انقلابی جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اس درخواست کا ذکر میں نے اپنی آخری رحم کی اپیل میں جو میں نے چیف کورٹ کے ججوں کو دی تھی میں کر دیا تھا لیکن چیف کورٹ کے ججوں نے میری کسی طرح کی درخواست منظور نہ کی۔ میں نے خود ہی جیل سے اپنے مقدمے کی بحث لکھ کر بھیجی جو چھاپی گئی۔ جب یہ بحث چیف کورٹ کے ججوں نے سنی انھیں بڑا شبہ ہوا کہ بحث میری لکھی ہوئی نہیں تھی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چیف کورٹ اودھ کے ذریعے مجھے عظیم سازشی کا خطاب دیا گیا۔ میرے پچھتاوے پر ججوں کو یقین نہ آیا اور انھوں نے اپنے خیالات کو اس طرح ظاہر کیا کہ اگر یہ (رام پرشاد) چھوٹ گیا تو پھر وہی کام کرے گا۔ میری ذہانت اور شعور پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے "بے رحم قاتل" کے نام سے نوازا گیا۔ قلم اُن کے ہاتھ میں تھا جو چاہا سو لکھا۔ لیکن 'کاکوری سازش' کا چیف کورٹ کا نامنصفانہ فیصلہ پڑھنے سے اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے سزائے موت کس خیال سے دی گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ رام

پر شاد نے سیشن جج کے خلاف نازیبا الفاظ کہے ہیں، محکمہ خفیہ کے کارکنوں پر بے بنیاد الزام لگائے ہیں جن مقدمے کے دوران جو ناانصافی ہوتی تھی اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے اس لیے رام پرشاد سب سے بڑا گستاخ ملزم ہے۔ اب معافی چاہے وہ جس شکل میں مانگے نہیں دی جاسکتی۔

چیف کورٹ سے اپیل خارج ہونے کے بعد حسب قاعدہ صوبے کے گورنر اور پھر وائسرائے کے پاس رحم کی اپیل کی گئی۔ رام پرشاد بسمل، راجندر ناتھ لاہڑی، روشن سنگھ اور اشفاق اللہ خاں کی سزائے موت کو بدل کر دوسری سزا دینے کی سفارش کرتے ہوئے یوپی کونسل کے تقریباً تمام منتخب ممبروں نے دستخط کر کے درخواست دی۔ میرے والد نے ڈھائی سو رئیس، اعزازی مجسٹریٹ اور زمینداروں کے دستخط سے ایک علاحدہ درخواست بھیجی لیکن عزت مآب ولیم میرس کی حکومت نے ایک نہ سنی۔ اسی وقت لجسلیٹو (Legislative) اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے 78 ممبروں نے دستخط کر کے وائسرائے کے پاس درخواست بھیجی کہ کاکوری سازش میں سزائے موت پائے ہوئے لوگوں کی سزا بدل کر دوسری سزا کر دی جائے کیوں کہ دورہ جج نے سفارش کی ہے کہ اگر یہ لوگ پچھتاوا کریں تو حکومت سزا کم کر سکتی ہے۔ چاروں ملزموں نے پچھتاوا ظاہر کر دیا ہے لیکن وائسرائے صاحب نے بھی ایک نہ سنی۔

اس بارے میں عالی جناب پنڈت مدن موہن مالویہ نے اور اسمبلی کے کئی دوسرے ممبروں نے وائسرائے سے مل کر بھی کوشش کی تھی کہ سزائے موت نہ دی جائے۔ اتنا ہونے پر بھی سب کو امید تھی کہ وائسرائے صاحب سزائے موت کے حکم کو رد کر دیں گے۔ اسی حالت میں خاموشی سے دسہرے سے دو دن پہلے جیلوں کو تار بھیج دیے گئے کہ رحم نہیں ہوگا۔ سب کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی جب جیل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے تار سنایا تو میں نے بھی کہہ دیا کہ آپ اپنا کام کیجیے۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے زیادہ کہنے پر کہ ایک تار رحم کی درخواست کا بادشاہ کے پاس بھیج دوں کیوں کہ یہ انھوں نے ایک طرح کا اصول بنا رکھا ہے کہ ہر پھانسی کے قیدی کی طرف سے جس کی رحم کی درخواست وائسرائے کے یہاں سے خارج ہو جاتی ہے وہ ایک تار بادشاہ کے نام سے صوبائی حکومت کے پاس ضرور بھیجتے ہیں۔ کوئی دوسرا جیل سپرنٹنڈنٹ ایسا نہیں کرتا۔ مندرجہ بالا تار لکھتے وقت یہ خیال آیا

کہ پریوی کونسل (سپریم کورٹ) انگلینڈ میں اپیل کی جائے۔ میں نے شری من موہن سکسینہ وکیل لکھنؤ کو اطلاع دی۔ باہر کسی وائسرائے کے ذریعے اپیل خارج ہونے کی بات پر یقین بھی نہ ہوا۔ جیسے تیسے کر کے موہن لال کے ذریعے پریوی کونسل میں اپیل کرائی گئی۔ نتیجہ جو پہلے سے معلوم تھا۔ وہاں سے بھی اپیل خارج ہوئی۔ یہ مانتے ہوئے کہ انگریز سرکار کچھ بھی نہ سنے گی۔ میں نے حکومت کو درخواست کیوں لکھی؟ کیوں اپیلوں پر اپیلیں اور رحم کی درخواستیں کیں؟ اس طرح کے سوالات اُٹھ سکتے ہیں۔

میری سمجھ میں ہمیشہ یہی آیا کہ سیاست ایک شطرنج کے کھیل کی طرح ہے۔ شطرنج کھیلنے والے ہمیشہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حسب ضرورت کس طرح اپنے مہرے مروا دینے پڑتے ہیں۔ بنگال آرڈی نینس کے قیدیوں کے چھوڑنے یا اُن پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کی تجویز جب اسمبلی میں پیش کی گئی تو حکومت کی طرف سے بڑے پرزور الفاظ میں کہا گیا کہ حکومت کے پاس پورا ثبوت ہے۔ کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے سے گواہوں پر آفت آسکتی ہے۔ اگر آرڈی نینس کے قیدی تحریری درخواست دیں کہ وہ مستقبل میں انقلابی تحریک سے کوئی واسطہ نہ رکھیں گے تو حکومت ان کو رہائی دینے کے بارے میں غور کر سکتی ہے۔ بنگال میں دکھنیشور اور شوبھا بازار بم کیس آرڈی نینس کے بعد چلے محکمہ خفیہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے قتل کا مقدمہ بھی کھلی عدالت میں ہوا۔ اور بھی کچھ ہتھیاروں کے مقدمے کھلی عدالت میں چلائے گئے لیکن کسی ایک بھی حادثے یا قتل کی اطلاع پولیس نہ دے سکی۔ کاکوری سازش کیس پورے ڈیڑھ سال تک کھلی عدالتوں میں چلتا رہا۔ ثبوت کے لیے تقریباً تین سو گواہ پیش کیے گئے۔ کئی مخبر اور اقبالی (پولیس کو اطلاع دینے والے اور اپنا جرم قبول کرنے والے) کھلے طور سے گھومتے رہے لیکن کہیں کوئی حادثہ یا کسی کو کوئی دھمکی کی اطلاع پولیس نے نہ دی حکومت کی ان باتوں کی پول کھولنے کی غرض سے میں نے تحریری حلف نامہ حکومت کو دے دیا۔ سرکار کے کہنے کے مطابق جس طرح بنگال آرڈی نینس کے قیدیوں کے بارے میں حکومت کے پاس پورا ثبوت تھا اور حکومت ان میں سے کئی قیدیوں کو خوفناک سازشی جماعت کا ممبر اور قتلوں کا ذمے دار سمجھتی اور کہتی تھی تو اسی طرح کاکوری کے سازشیوں کے تحریری حلف نامے پیش کرنے پر کوئی غور کیوں نہیں کیا گیا؟ بات یہ ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ مجھے تو اچھی طرح معلوم تھا کہ یوپی میں جتنے سیاسی مقدمے چلائے جاتے ہیں ان کے فیصلے خفیہ پولیس

کی مرضی کے مطابق لکھے جاتے ہیں۔ بریلی پولیس کانسٹیبلوں کے قتل کے مقدمے میں بالکل بے گناہ افراد کو پھنسادیا گیااور سی آئی ڈی والوں نے اپنی ڈائری دکھاکر فیصلہ لکھوایا۔ کاکوری سازش میں بھی آخر میں ایسا ہی ہوا۔ حکومت کی تمام چالوں کو جانتے ہوئے میں نے تمام کام اس کی لمبی لمبی باتوں کی پول کھولنے ہی کے لیے کئے۔ کاکوری کے موت کی سزا پائے ملزموں کی رحم کی درخواست نامنظور کرنے کا کوئی خاص سبب حکومت کے پاس نہیں۔ حکومت نے بنگال آرڈی نینس کے قیدیوں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہی کاکوری والوں نے کیا۔ سزائے موت کو رد کردینے سے ملک میں کسی طرح کا نقص امن کا خطرہ یا کسی بغاوت ہو جانے کی اُمید نہیں تھی۔ خاص طور پر جب ملک بھر کے سب طرح کے ہندو مسلمان اسمبلی ممبروں نے اس کی سفارش کی تھی۔ سازشیوں کی اتنی بڑی سفارش اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ لیکن حکومت تو اپنا سارا کام سیدھا رکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ سر ولیم میرس نے ہی خود شاہجہاں پور اور الہٰ آباد کے ہندو مسلم فسادات کے ملزموں کی سزائے موت رد کردی جن کو الہٰ آباد ہائی کورٹ سے سزائے موت دینا ہی مناسب سمجھا گیا تھا اور ان لوگوں پر دن دہاڑے قتل کرنے کے سیدھے ثبوت موجود تھے۔ یہ سزائیں ایسے وقت معاف کی گئی تھیں جب کہ ہر روز ہندو مسلم فسادات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اگر کاکوری کے قیدیوں کی سزائے موت معاف کر کے دوسری سزا دینے سے دوسروں کا جوش بڑھتا تو کیا اسی طرح مذہبی فسادات کے بارے میں بھی نہیں ہو سکتا تھا؟ مگر وہاں تو معاملہ کچھ اور ہی ہے جواب اہل ہند کے نرم سے نرم دل کے لیڈروں کے بھی شاہی کمیشن کے مقرر ہونے اور ان میں ایک بھی ہندوستانی کے منتخب نہ ہونے، پارلیمنٹ میں ہندوستان کے سکریٹری لارڈ برکن ہیڈ کے اور دوسرے لیبر پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں سے اچھی طرح سمجھ میں آیا ہے کہ کس طرح ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کی چالیں چلی جا رہی ہیں۔

میں جان دیتے وقت مایوس نہیں ہوں کہ ہم لوگوں کی قربانی ضائع گئی۔ میرا تو یقین ہے کہ ہم لوگوں کی پوشیدہ آہوں کا ہی یہ نتیجہ ہوا کہ لارڈ برکن ہیڈ کے دماغ میں پرماتما نے ایک خیال ڈالا کہ ہندوستان کے ہندو مسلم فسادات کا فائدہ اُٹھاؤ اور ہندوستان کی زنجیریں اور کس دو۔ گئے تھے روزے بخشوانے اور نماز گلے پڑ گئی۔ ہندوستان کی ہر مشہور سیاسی جماعت نے اور

ہندوؤں کے تو تقریباً تمام اور مسلمانوں کے بھی زیادہ تر لیڈروں نے ایک آواز ہو کر رائل کمیشن (شاہی کمیشن) کے تقرر اور اس کے ممبروں کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور کانگریس کے مدراس میں ہونے والے اجلاس میں سب سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور ہندو مسلمان ایک ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ وائسرائے نے جب ہم کاکوری کے سزائے موت والوں کی رحم کی درخواست نامنظور کر دی تھی اسی وقت میں نے موہن لال جی کو خط لکھا تھا کہ ہندوستانی لیڈروں کو اور ہندو مسلمانوں کو اگلے اجلاس میں جمع ہو کر ہم لوگوں کی یاد منانی چاہیے۔ حکومت نے اشفاق اللہ کو رام پرشاد کا دایاں ہاتھ قرار دیا۔ اشفاق اللہ کٹر مسلمان ہو کر پکے آریہ سماجی رام پرشاد کی انقلابی جماعت کے بارے میں اگر دایاں ہاتھ بن سکتے ہیں تب کیا ہندوستان کی آزادی کے نام پر ہندو مسلمان اپنے نجی چھوٹے چھوٹے مفادات کا خیال نہ کر کے آپس میں ایک نہیں ہو سکتے۔ (49)

پرماتما نے میری پکار سن لی اور میری خواہش پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ میں تو اپنا کام کر چکا۔ میں نے مسلمانوں میں سے ایک نوجوان نکال کر ہندوستانیوں کو دکھا دیا جو ہر امتحان میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ پہلا تجربہ تھا جو پوری طرح کامیاب ہوا۔ اب اہل وطن سے درخواست ہے کہ اگر وہ ہم لوگوں کے پھانسی پر چڑھنے سے ذرا بھی رنجیدہ ہوئے ہوں تو انھیں سبق لینا چاہیے کہ ہندو مسلمان اور سیاسی جماعتیں ایک ہو کر کانگریس کو اپنا نمائندہ مانیں۔ جو کانگریس طے کرے اسے سب پوری طرح مانیں اور اس پر عمل کریں۔ ایسا کرنے کے بعد وہ دن بہت دور نہ ہوگا جب انگریزی حکومت کو اہل ہند کی مانگوں کے سامنے سر جھکانا پڑے اور اگر ایسا کریں گے تب تو آزادی کچھ دور نہیں۔ کیوں کہ پھر تو اہل ہند کو کام کرنے کا پورا موقعہ مل جائے گا۔ ہندو مسلم ایکتا ہی ہم لوگوں کی یادگار اور آخری خواہش ہے چاہے وہ کتنی ہی دشواریوں سے کیوں نہ حاصل ہو۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہی شری اشفاق اللہ خاں کی بھی رائے ہے کیوں کہ اپیل کے وقت ہم دونوں لکھنؤ جیل میں پھانسی کی کوٹھریوں میں آمنے سامنے کئی دن تک رہے تھے۔ آپس میں ہر طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔ گرفتاری کے بعد سے ہم لوگوں کی سزا بڑھنے تک شری اشفاق اللہ خاں کی بڑی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک بار مجھ سے مل لیتے جو پرماتما نے پوری کر دی۔

شری اشفاق اللہ تو انگریزی حکومت سے رحم کی درخواست کرنے پر راضی ہی نہ تھے۔ ان کا تو یقین راسخ تھا کہ خداوند کریم کے علاوہ کسی دوسرے سے رحم کی درخواست نہ کرنی چاہیے لیکن میرے بہت زیادہ زور دینے پر ہی انھوں نے حکومت سے رحم کی درخواست کی تھی۔ اس کا مجرم میں ہی ہوں جو میں نے اپنی محبت کے حقوق کا استعمال کر کے اشفاق اللہ خاں کو ان کے عزم محکم سے ہٹادیا۔ میں نے ایک خط کے ذریعے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے بھیادوج کے موقع پر گورکھپور جیل سے بھی اشفاق کو خط لکھ کر معافی مانگی تھی۔ پرماتما جانے کہ وہ خط ان تک پہنچا بھی یا نہیں خیر! پرماتما کی ایسی ہی خواہش تھی کہ ہم لوگوں کو پھانسی دی جائے۔ اہل وطن کے جلے ہوئے دلوں پر نمک پڑے وہ بلبلا اٹھیں اور ہماری روحیں ان کے کاموں کو دیکھ کر رنجیدہ ہوں۔ جب ہم نئے جسم اختیار کر کے خدمت وطن میں حصہ لینے کے لیے دوبارہ آئیں اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی حالت پوری طرح سدھری ہوئی ہو۔ عوام کا زیادہ حصہ تعلیم یافتہ ہو جائے۔ دیہی افراد بھی اپنے فرائض سمجھنے لگیں۔

پریوی کونسل میں اپیل بھجوا کر میں نے جو فضول خرچی کی اس کا بھی ایک خاص مطلب تھا۔ تمام اپیلوں کا مقصد یہی تھا کہ سزائے موت مناسب نہیں۔ کیوں کہ نہ جانے کس کی گولی سے آدمی مارا گیا۔ اگر ڈکیتی ڈالنے کی ذمہ داری کے خیال سے سزائے موت دی گئی تو چیف کورٹ کے فیصلے کے مطابق بھی میں ہی ڈکیتیوں کا ذمے دار اور لیڈر تھا اور صوبے کا لیڈر بھی میں ہی تھا۔ اس لیے سزائے موت تو صرف مجھے ہی ملنی چاہیے تھی۔ باقی تین کو پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ دوسری تمام سزائیں منظور ہوتیں۔ لیکن ایسا کیوں ہونے لگا؟ میں ولایتی عدالت کا بھی امتحان لے کر اہل وطن کے لیے ایک مثال چھوڑنا چاہتا تھا کہ اگر کوئی سیاسی مقدمہ چلے تو وہ کبھی بھول کر بھی کسی انگریزی عدالت کا یقین نہ کرے۔ جی چاہے تو زوردار بیان دے۔ ورنہ میری تو یہی رائے ہے کہ انگریزی عدالت کے سامنے نہ تو کبھی کوئی بیان دے اور نہ کوئی صفائی پیش کرے۔ کاکوری سازش کے مقدمے سے یہی نصیحت ملتی ہے۔ اس مقدمے میں ہر طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ پریوی کونسل میں اپیل داخل کرانے کا ایک خاص مطلب یہ بھی تھا کہ میں کچھ عرصے تک پھانسی کی تاریخ ٹال کر یہ امتحان کرنا چاہتا تھا کہ نوجوانوں میں کتنا دم ہے اور اہل وطن کتنی امداد دے سکتے ہیں۔ اس میں مجھے مایوس کن ناکامی ہوئی۔ آخر میں میں نے طے کیا تھا کہ اگر ہو سکے تو جیل سے بھاگ

نکلوں۔ایسا ہو جانے سے حکومت کو باقی تینوں پھانسی پانے والوں کی سزا معاف کر دینی پڑے گی اور اگر نہ کرتے تو میں کیا کر لیتا۔ میں نے جیل سے بھاگنے کی مختلف کوششیں کیں لیکن باہر سے کوئی امداد نہیں ملی۔اسی سے تو دل کو دھکا لگتا ہے کہ جس ملک میں میں نے اتنی بڑی انقلابی تحریک اور سازشی جماعت کھڑی کر دی تھی وہاں سے مجھے زندگی کی حفاظت کے لیے ایک ریوالور تک نہ مل سکا۔ایک نوجوان بھی مدد کے لیے نہ آسکا(9) آخر میں پھانسی پا رہا ہوں۔ پھانسی پانے کا مجھے کوئی شوق نہیں کیوں کہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ مگر میں نوجوانوں سے پھر بھی عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ جب تک ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد تعلیم یافتہ نہ ہو جائے، جب تک انھیں فرائض اور غیر فرائض کا احساس نہ ہو جائے تب تک بھول کر بھی کسی طرح کی انقلابی سازشوں میں حصہ نہ لیں۔اگر خدمت وطن کی خواہش ہو تو کھلی تحریکوں کے ذریعے حسب استطاعت کام کریں ورنہ ان کی قربانی رائیگاں ہوگی۔ دوسرے طریقے سے ملک کی اس سے بہتر خدمت ہو سکتی ہے جو زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔ حالات موافق نہ ہونے سے ایسی تحریکوں میں محنت اکثر بے کار جاتی ہے۔ جس کی بھلائی کرو وہی بُرے بُرے نام دھرتے ہیں اور آخر کار دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے جان دینی پڑتی ہے۔

اہل وطن سے یہی آخری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ کریں سب مل کر کریں اور سب دیس کی بھلائی کے لیے کریں۔ اس سے سب کا بھلا ہوگا۔

مرتے "بسمل"، "روشن"، "لہری"، "اشفاق" اتیاچار سے ا
ہوں گے پیدا سینکڑوں ان کے رُدھر کی دھار سے اا

فرہنگ اور اشارے

1- تومر دھار:۔ مدھیہ پردیش کے مورینا ضلع میں چنبل ندی پر واقع ایک بڑے زمینی خطے کو تومر دھار کہا جاتا ہے۔ اسی علاقے میں چنبل ندی کے کنارے بروائی اور رُوار نام کے دو گاؤں ہیں۔ میرینا ضلع آزادی سے قبل گوالیار کی دیسی ریاست میں تھا۔ خاتون ڈاکو پتلی بائی بروائی گاؤں کی تھی۔

2- بیہڑ:۔ چنبل ندی نے اپنے دونوں کناروں کی ہزاروں ہیکٹیر زمین کو کاٹ کر اونچے نیچے ٹیلوں اور گہری وادیوں میں بدل دیا ہے۔ اس علاقے کو دشوار راہ کا علاقہ یعنی بیہڑ کہتے ہیں۔ اس میں آمد و رفت دشوار ہے۔ ٹھاکر ملکھان سنگھ، پتلی بائی، پھولن دیوی وغیرہ ڈاکو انھیں بیہڑوں میں چھپے رہتے تھے۔

3- انگریزی ریاست:۔ آزادی سے قبل ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان کے جن علاقوں پر انگریزوں کا پورا قبضہ تھا انھیں انگریزی ریاست کا علاقہ کہتے تھے۔ ملک کے باقی حصے میں گوالیار، اندور، جے پور وغیرہ راجاؤں کی ریاستیں تھیں۔ ان کو ریاست کہتے تھے۔

4- شودر ذات:۔ یہاں شہید رام پرشاد بسمل نے ذات پات کے سسٹم کی مخالفت کی ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان ذات کے نام پر کوئی تفریق نہیں کرتے تھے اور سب کو مساوی تسلیم کرتے تھے۔

5- میزینی:۔ میزینی اٹلی کے قومی انقلابی تھے۔ انھوں نے اپنے ملک میں آزادی اور جمہوریت کے لیے تحریک چلائی۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے انقلابیوں پر میزینی کے خیالوں کا بڑا اثر پڑا تھا۔

6- بھائی پرمانند:۔ بھائی پرمانند ہندوستان کے ایک عظیم قومی رہنما تھے ان کا ہندوستان اور بیرون ہند یورپ امریکہ

اور کناڈا میں کام کر رہے ہندوستانی انقلابیوں سے تعلق تھا۔ لاہور سازش کیس میں بھائی پرمانند کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی لیکن بعد میں عمر قید میں بدل گئی تھی۔

7-دیش واسیوں سے گزارش: (الف) "دیش واسیوں سے نویدن" عنوان کا پرچہ مشہور انقلابی رہنما اور مفکر شچیندر ناتھ سانیال نے لکھا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے پرچہ "ریولشنری اور بندی جیون بحث مباحثہ"، "سماج اور تہذیب" وغیرہ کتابیں بھی لکھی تھیں۔ یہ پرچہ اور کتابیں ہندوستان کی انقلابی تحریک اور انقلابیوں کی نظریات پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالتی ہے۔ شچیندر ناتھ سانیال کو کاکوری سازش کیس میں عمر قید کی سزا ملی تھی۔ اس کیس میں رام پرشاد بسمل کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ "دیش واسیوں سے نویدن" پرچہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اس میں لکھا گیا تھا: "انقلابی تحریک دہشت گردی نہیں ہے کیونکہ ہندوستان میں کسی بھی انقلابی کو یہ یقین نہیں ہے کہ صرف دہشت گردی ہی سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر حکومت کے مظالم کے خلاف ایک دو آدمی بھری ہوئی پستول کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ انقلابی محض دہشت گردی کی جنگ لڑنا چاہتے ہیں"۔

(ب) گیندا لال دکشت انقلابی رہنما تھے انھوں نے ماتر ویدی اور شیواجی سمیتی نام کی انقلابی تنظیمیں بنائی تھیں۔ رام پرشاد بسمل ان تنظیموں کے ممبر تھے دکشت جی اور بسمل مین پوری سازش کیس میں ملزم تھے۔

8 شرادھ انقلابی آپسی خط و کتابت میں کوڈ لفظوں کا استعمال کرتے تھے تاکہ پولیس کو ان کے کاموں کا پتہ نہ چل سکے۔ یہاں شرادھ لفظ کا استعمال میٹنگ کے لیے کیا گیا ہے۔ جماعت میں انقلابیوں کا نام بھی بدل دیا جاتا تھا یہاں رام پرشاد بسمل نے خط پر اپنے خفیہ نام زدر سے دستخط کئے ہیں۔

9نوٹ: رام پرشاد بسمل کے انقلابی ساتھی چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ، شیو ورما وغیرہ نے خفیہ طور سے انھیں گورکھ پور جیل سے فرار کروانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہ ملی اور رام پرشاد بسمل کو جیل میں اس کی خبر نہ مل پائی تھی کہ ان کے ساتھی انہیں جیل سے فرار کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

[illegible]

صفحات 172

قیمت -/11 روپے

انیس (سوانح)

صفحات 472

قیمت -/174 روپے

[illegible]

صفحات 645

قیمت -/208 روپے

[illegible]

صفحات 107

قیمت -/38 روپے

[illegible]

صفحات 136

قیمت -/69 روپے

[illegible]

صفحات 688

قیمت -/97

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066